Drawn by Faiz Ahmad

گیارھویں صدی سے پہلے جس وقت علم سیاست کے ماہر مدبر اکبر بادشاہ کے بیٹے جہانگیر صاحب تاج تھے۔ انہیں دنوں پھاگن کے مہینے میں ایک دن شام سے کچھ پہلے پٹنہ گرام کے نیچے بہنے والی ندی کے کنارے ایک نوجوان اپنے رخساروں پر ہاتھ رکھے ہوئے کچھ غمگین اور متفکر بیٹھا تھا۔ دن بھر اپنی جلتی ہوئی کرنوں سے تمام دنیا کو تپا کر سورج دیوتا پچھم کی طرف جا رہے تھے۔ دیواروں پر سنہرے اور روپہلے نقش و نگار کا ایک دلکش مرقع نظر آتا تھا۔ شام ہونے کو ہی تھی۔ جس جگہ وہ نوجوان متفکر بیٹھا تھا پٹنہ گرام کا وہ حصہ گنجان جنگلوں پر مشتمل تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ نوجوان بیچارہ مغموم و ملول ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں دنیا تاریک تھی۔ ایسی خطرناک اور دشوار گذار جگہ میں وہ بیٹھا ہوا کیا سوچ

رہا تھا؟ خوش نوا پرند چپ ہو رہے تھے۔ شام کی تاریکی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لب دریا درختوں کی قطاریں عجیب کیفیت دکھا رہی تھیں۔ دریا عالم سکوت میں خاموشی سے بہا جا رہا تھا۔ کیا اس کی آنکھیں انہیں نظاروں میں محو تھیں۔ نہیں پاؤں کے نیچے کوہستانی ندی لہروں کے اٹھنے سے حالت تموج میں زور شور سے بہہ رہی تھی۔ پاس ہی تاریکی پسند گیدڑوں کا گروہ شام کی آمد پا کر اپنی ماند سے باہر نکل کر آپس میں ٹولیاں بنا کر ایک دوسرے کا بدن چاٹ رہے تھے۔ یہ نوجوان کیا انہی نظارہ میں محو تھا؟ سطح آب پر تیرنے والی ہری ہری بیلیں حجاب و شرم سے کبھی آگے کبھی پیچھے پاؤں۔ کھنچنے والی نئی بہوؤں کی طرح گنگا کی پُرشور روانی میں ناز و انداز سے کبھی دور جا کر کبھی نزدیک آ کر عجیب و غریب بہار دکھا رہی تھیں۔ کیا نوجوان انہی عجیب و غریب نظاروں کی بہار لوٹ رہا تھا؟ نہیں۔ غوطے کھاتے ہوئے کچھوے وغیرہ آبی جانور شام کی ہوا کھانے کے لئے پانی سے اپنا سر نکالے ہوئے تھے۔ یہ تمام نظارے بطور خود ایسے نہیں تھے کہ نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرتے۔ وہ فکر کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اسے کس بات کی فکر تھی۔ سوائے اس کے یہ کون کہہ سکتا ہے؟ اس کی بلند پیشانی پر قطرات عرق نمایاں تھے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں رواں تھیں۔ وہ مادر قدرت کے قدرتی مخملی فرش پر بیٹھا ہوا نہ معلوم کس خیال میں محو تھا۔ رہ رہ کر سرد آہیں بھرتا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا گویا کوئی پتھر کی مورتی ندی کے کنارے رکھی ہوئی ہے۔

یکایک درختوں کے بیچ سے نکل کر ایک موہنی عورت آہستہ آہستہ نوجوان کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس لق و دق جنگل میں ایسی غیر معمولی عورت کو آتے ہوئے دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ سوائے بن دیوی کے وہ اسے اور کیا سمجھتا؟ وہ مہرو آہستہ آہستہ قدم جماتی نوجوان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ نوجوان کی نگاہوں سے بے پروائی اور نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ عورت خاموش رہی۔ بہت دیر بعد نوجوان نے کہا

”پدماوتی! تم یہاں کہاں؟“

حسینہ نے کہا۔ "نکمار! بدنصیب بیوی کو اور کتنے دنوں تک
کلپاؤ گے؟"
نکمار نے جواب دیا۔ "بار بار یہ باتیں کہہ کر تم مجھے پریشان نہ کرو۔ میں تمہیں
کیا دکھ دیتا ہوں؟"
پدما۔ "کیا تم مجھے دکھ نہیں دیتے؟ جب تمہاری بیوی ہو کر تم نے مجھے
چھوڑ دیا ہے۔ کیا میرے تمام دکھوں کا سبب یہ نہیں ہے؟"
نکمار پریشان ہو کر بولے۔ "یہ سب میں کچھ نہیں جانتا۔ تم نے پھر
چھپا کیوں کیا؟"
پدما۔ "تم ہمیشہ یہاں آتے ہو۔ یہ جگہ ہم دونوں کے بات چیت کرنے کے
لئے بہت مناسب اور اچھی ہے۔ سامی نے بہت دکھ اٹھا کر دنوں سے
یہاں پہنچی ہوں۔ مجھے اب زیادہ نہ ستاؤ۔"
اتنا کہتے کہتے عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نکمار نے اسے
نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا۔ "تم میری بیاہتا بیوی ہو۔ یہ میں مانتا ہوں
مگر میں اب تمہیں قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ تم مسلمانی ہو؟"
عورت نے کپڑے کے آنچل سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں
کی جھڑی لگ گئی۔ نکمار سمجھ گئے کہ یہ رو رہی ہے۔ ذرا دیر بعد اس نے آنسو
پونچھ کر جواب دیا۔ "پران پیارے! میں مسلمانی ضرور ہوں۔ مگر خواہ کچھ بھی ہو میں
تو تمہاری ہی بیوی! تمہاری ہی خادمہ! شوہر کے بن بیوی کی گتی ہوتی ہے
شوہر ہی سب کچھ ہے۔ ناتھ! عورت اپنے شوہر کے ساتھ مصیبت میں بھی
خوش رہتی ہے۔ مگر اس بدنصیب نے تو وہ تعلیم پائی ہی نہیں۔ وقت سے پہلے
ہی تمہارے قدموں سے دور ہو گئی۔ ایشور نے جیسے تم سے چھڑا لیا
میں ضرور گنہگار ہوں۔ اگر ان تمام گناہوں کا کفارہ نہیں ہے تو تمہارے
قدموں میں زندگی کو ختم کر کے اس گنہگار جسم کا خاتمہ کر دوں گی۔ میں نے تم

کی قدر اب جاتی ہے۔ اب نہ چھوڑونگی۔ جہالت کی تاریکی میں گمراہ ہو کر میں نے پاپ کے راستے میں آوارہ گردی اختیار کی ہے۔ مگر اے جانِ آرزو! یکایک میرا تاریک دل تمہارے نور سے منور ہوا! میری روح دکھ کی آگ سے جل رہی ہے۔ اس وقت اگر تم مجھے بیوی کی حیثیت سے قبول کرو۔ تو میری روح کو کسی قدر اطمینان اور خوشی میسر ہو سکتی ہے۔ تمہارے قدموں کے سوا مجھے اور کہیں ٹھکانا نہیں میں تمہارے قدموں کو اپنے جلتے ہوئے سینے سے لگا کر اپنا یہ پاپی جسم پاک کر دونگی۔"

اس قدر کہکر بیدما وتی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ نوکمار نے تمام باتیں سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ بالآخر اپنے بیتاب دل کی حرکت کو سنبھال کر بولے "بیدما! میں پاپی ہوں۔ میں نے دنیا میں جو پاپ کیا ہے۔ اس کا کسی طرح پرائشچت نہیں ہو سکتا۔ میں ہی ناکردہ گناہ بے قصور۔ سادھوی مرن مئی کی بیوقت موت کا سبب ہوں۔ میری بدسلوکی نے ہی اس کی جان لی ہے۔ یہ قلق میرے دل سے کبھی دور نہ ہوگا۔ اس گنہگار جسم کو تکلیف دیکر جسطرح ہو سکیگا۔ میں اس پاپ کا پرائشچت کرونگا۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ میری دلی آرزو یہی ہے۔ کہ میری جان مرن مئی کے پاک تصور میں ہی محو ہو کر نکل جائے۔ گنگا ماتا! تم نے آئندہ حالت سے ناواقف معصوم مرن مئی کو اپنی گود میں لے لیا ہے۔ اس بدنصیب کو اور کیوں دکھ دیتی ہو؟ مجھے بھی چرنوں میں جگہ دیکر دنیا کے دکھوں سے میرا چھٹکارا کرو۔" یہ کہکر نوکمار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ذرا ہوش سنبھال کر بولے "بیدما! دنیا ہمارے لئے اس وقت تاریک ہو رہی ہے۔ اب مجھے کسی شئے کی خواہش نہیں ہے۔ ایک مرن مئی کے بغیر میرے لئے دنیا تاریک ہو رہی ہے۔ بیدما! میرے لئے تم اور تکلیف نہ اٹھاؤ۔ تم جس حالت میں تھیں۔ اسی حالت میں جا کر آرام سے رہو۔ بیفائدہ کیوں اپنی امیدوں کا خون کر کے دکھ اٹھاتی ہو۔ تمہارے مسلمانی ہونے سے مجھے اس قدر اعتراض

نہیں ۔ مگر اب میں دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہونگا میں نے اسی طرح زندگی بسر کرنیکا ارادہ کرلیا ہے میں کسی کو اپنی پاپی زندگی کا ساتھی بنا کر تکلیف دینا نہیں چاہتا پدما ! میری صحبت سے سوائے دُکھ کے کچھ نصیب نہ ہوگا تیری امید اور میرا خیال چھوڑ دو۔"

نوکمار کی یہ باتیں سنکر پدما کے دل میں جیسے چھری اتر گئی ۔ اُسے کیا خبر تھی ۔ کہ قسمت اُسے اس طرح ناچ نچائیگی ۔ اور دل کو ایسے ایسے صدمے اٹھانے پڑیں گے ۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا : " ناتھ ! تم مجھے بیکار ہی ٹھکرا رہے ہو ۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا ہے جان جائے ۔ تو جائے تمہارے ساتھ رہ کر اگر ضرورت پڑیگی تو فاقہ کشی کر لونگی ۔ مگر تمہارا دامن نہ چھوڑونگی میں تمہاری ہوں ۔ تم مجھے چھوڑ دو گے ۔ تو بھی میں تمہیں نہ چھوڑونگی ۔"

نوکمار نے اس بات کا جواب نہ دیا ۔ ذرا فکر مند ہو کر بولے : " پدما ! اندھیرا ہو گیا ہے گھر جاؤ ۔ اس کا فیصلہ بعد ہوگا ۔

اتنا کہہ کر انہوں نے ایک لمبا سانس لیا ۔ پدما نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ انداز سے کہا : " پران پیارے ! داسی کی ایک عرض قبول کرو ۔ کل ایک بار میرے قیام گاہ پر آؤ ۔"

نوکمار " اس کیلئے میں اس وقت وعدہ نہیں کر سکتا ۔" ابتک دونوں بات چیت میں محو تھے تاریکی اچھی طرح پھیل گئی تھی ۔ یکایک دونوں کو خیال آیا ۔

پدما نے کہا : " ناتھ ! مجھے بھولنا نہیں ۔ تمہارے حضور میں یہی بنتی کرتی ہوں ۔" اتنا کہکر دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے ۔ اور دیکھتے دیکھتے جنگل سے غائب ہو گئے ۔

کی ضرورت کیا ہے؟ ہمیشہ دان! اس میں پوچھنے کی بات ہی کیا ہے۔ اُن سے ملنے کیلئے تو میں خود بھی جانا چاہتی ہوں۔ مگر یہ بالکل غیر ممکن ہے۔ اُن سے کہنا۔ اُن کو جب موقع ملے۔ اور جب طبیعت چاہے شوق سے آسکتی ہیں۔

اِس فقرہ کے کہتے ہی وہ واپس چلی آئی۔

شیاما سُندری گھر گئی۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھڑی رہی اُس کے چہرہ پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ دوسرے ہی لحظہ میں وہ بیہوش ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُسکی دونوں آنکھوں سے موتیوں کی طرح سے آنسوؤں کی بوندیں گر کر زمین کو سیراب کرنے لگیں۔ شیاما اپنی بھاوج مرن مئی کو بہت پیار کرتی تھیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اُس کے بغیر ہر وقت مغموم اور ملول رہتی تھی۔ اسی لئے پیار سے اس کا نام مرن مئی رکھا تھا۔ آج جان سے زیادہ عزیز مرن مئی کی اچانک موت سے وہ بہت دُکھی ہوئی تھی۔ اُسے پچھلی تمام باتیں یاد آگئیں۔ اور اُن کی یاد نے دل میں رنج و حزن کا عالم پیدا کر دیا۔ ان واقعات نے مرن مئی کے چہرہ کی یاد دلا دی۔ اُس کی موت کی یاد نے کلیجہ میں جیسے ہوک اٹھنے لگی۔ انہیں سب باتوں کو سوچ سوچ کر وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ اُس کے دل میں تبدیلی ہونے لگی اُس وقت اُس کے چہرے پر مسرت کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ کیا؟ شیاما کیا دیوانی تھی؟ نہیں اُس کے دل میں اس وقت مسرت کی مختلف لہریں موجزن تھیں۔ اس وقت اُسے اپنے بڑے بھائی کی پہلی بیوی کی یاد ستا رہی تھی۔ شادی کے بعد صرف ایک ہی مرتبہ میں پیو کیلئے پدما سسرال آئی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر کل بارہ تیرہ برس کی تھی۔ یہ آج کتنے دنوں کی بات تھی! اُس کے بعد اُس کی زندگی میں کس قدر تبدیلی ہوئی۔ پدما اس وقت جوبن کے آخری زینہ پر اُتر آئی تھی۔ اُس کے باپ رام گوبند گھوشال اپنے کنبے کے ساتھ مسلمان ہوگئے۔ آخرکار پدما بھی مسلمان ہوگئی۔ اُس وقت سے پدما کی خبر کسی نے بھی نہ لی۔ پدما سے اُس کا قطع تعلق ہو چکا تھا ...... یہ کتنے دنوں کی بات ہے؟ اتنے دنوں بعد اب پدما بنگال میں آئی تھی۔ خواہ کچھ ہی ہو وہ شیاما سُندری کی بھاوج تھی۔ اُس کی محبت و پیار کی مستحق تھی۔ اتنے دنوں بعد پھر اس سے ملاقات ہوگی۔ کیا یہ خوشی کی بات نہ تھی؟

شیاما یہ تمام باتیں سوچتے سوچتے خوشی سے اچھل پڑی - اس کے چہرہ پر مسرت کی کچھ ایک روحانی دمک دینے لگی - دل دیوانہ محبت ہو گیا - وہ ذرا مسکرانے لگی - خوشی کی بات ہی ایسی ہے خوشی ضعیف کو جوان اور رنج جوان کو ضعیف بنا دیتا ہے - نوجوان شیاما بھی اس وقت فرط مسرت سے بچوں کی طرح خوشی میں پھولی نہ سماتی تھی - وہ خود بخود ہنستی تھی جن کے دلوں کو موقع پر اس قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے - وہ سمجھ جائیں گے - کہ شیاما کس قدر بے صبری سے اس موقع کا انتظار کر رہی تھی -

جس وقت پدما سسرال آئی تھی اس وقت وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھی - اس کی ماں نے ساس وغیرہ سے بہت بات چیت کرنے کو منع کر دیا تھا - پدما نے اس حکم کی لفظ بلفظ تعمیل کی - وہ اپنی نند شیاما کے سوا اور کسی سے نہیں بولتی تھی - بچپن کی سکھی شیاما اور پدما کے دلوں میں اس رشتہ کے سوا ایک دوسرا رشتہ بھی پیدا ہو گیا تھا - وہ رشتۂ محبت تھا - دور رہنے - الگ ہو جانے اور دھرم بھرشٹ ہونے کی وجہ سے اس رشتہ کی گرہیں کچھ ڈھیلی سی ہو گئی تھیں - آج تمام باتیں یاد آ گئیں ملاقات کی تمنا میں تمام رگیں جیسے کھنچ سی گئیں - ڈھیلی گرہیں مضبوط پڑ گئیں کتنی دیر میں ملاقات ہوگی - وہ بیتابی سے انہیں خیالات میں محو ہو کر انتظار کرنے لگی -

شیاما جس وقت اس قسم کے مسرت بخش دریا میں غوطے کھا رہی تھی عین اس وقت وہاں نوکمار آ پہنچے - نوکمار کو دیکھ کر اس کے مسرت کا جوش اور بھی بڑھ گیا اس نے سوچا بھیا کو پدما کے اس دیس میں آنے کی بابت کچھ علم نہیں ہے انہیں یہ خبر دینی چاہئے پھر سوچنے لگی نہیں ان سے کہنا مناسب نہیں شاید وہ ملنے میں رکاوٹ پیدا کریں تب تو میری دیرینہ آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو جائیگا - پھر سوچا اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ کہکر دیکھوں تو سہی" یہ سوچ کر اس نے کہا "بھیا! ہماری بڑی بھو یہاں آئی ہیں" -

نوکمار کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے کوئی علامات نہ تھے - انہوں نے کہا -

"شیاما! یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے"

شیاما - "تم جانتے ہو - مگر مجھے تو آج ہی معلوم ہوا ہے" -

نوکمار "کس نے کہا؟"

شیاما "انہیں کی داسی نے"

نوکمار "کیسے؟"

شیاما "وہ ہم لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں یہی دریافت کرنے کیلئے انہوں نے اسے بھیجا تھا میں نے انہیں آنے کیلئے کہلا بھیجا ہے"

نوکمار خاموش رہے اس خاموشی میں اجازت کی جھلک نہیں تھی۔۔۔۔ بلکہ اس سے نمایاں طور پر ناراضگی کا اظہار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ باہر چلے گئے۔ نوکمار کے دل کی حالت کا پتہ **شیاما** کو نہیں چلا۔ شیاما نوکمار کی خاموشی میں اجازت کا پتہ پاکر بہت خوش ہوئی۔ مرلی کے گنگا جی میں گرنے کے بعد سے **نوکمار** کسی کام میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ شیاما نے اس میں بھی وہی جھلک دیکھی۔ شیاما کی رائے کیا غلط تھی؟ کبھی نہیں جن کے دل میں چھل کپٹ نہیں ہوتا۔ دنیا میں وہی سکھی ہوتے ہیں۔
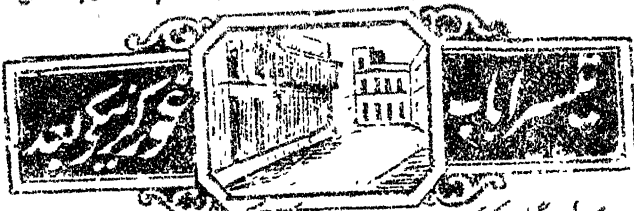
دوسرا باب
عزیز بیگم

چونکہ گنگا کے گھاٹ بازار میں سامنے ایک دو منزلہ مکان تھا۔ یہ بہت خوبصورت مکان تھا۔ اسی کی اوپری منزل میں ایک کمرے میں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کا لباس مسلمانی تھا۔ ناظرین دونوں کو پہچانتے ہونگے۔ انہوں نے گنگا کے کنارے نوکمار کے ساتھ **پدما** کو دیکھا ہے۔ یہ نازنین وہی **پدماوتی** تھی جس نے مسلمانی پوشاک زیب تن کی ہوئی تھی۔ چہرے سے جلالی ٹپک رہا تھا۔ آنکھوں میں تیزی پیدا کر رہی تھیں۔ حسن کی حد نہیں تھی۔ وہ اس وقت بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ مسرت رگ رگ میں کلولیں کر رہی تھی۔ اس [illegible] **پدماوتی** کو دیکھا تھا۔ آج وہ دیکھنے سے [illegible] خوش [illegible] کی طرح لدی ہوئی تھی۔

پدما اٹھی۔ نہ معلوم کیا یاد آیا کچھ سوچ کر بولی "پیشوان! ایک ساڑھی لا دو" پیشوان دوڑ کر فوراً ہی لے آئی جب پدما نے مسلمانی لباس اتار کر بنگالی پوشاک پہنی! وہ پیشوان سے مخاطب ہو کر بولی "دیکھو! میں کیسی لگتی ہوں" پیشوان نے کہا "بنگالی لباس آپ کو کیا زیب دیتا ہے! وہ تو نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے"

پدما نے پیشوان کی بات پر یقین نہیں کیا۔ آئینہ کے پاس جا کر اپنا منہ آپ ہی دیکھنے لگی۔ چہرہ پر سنجیدگی آگئی کیسی بڑی فکر نے دل پر تسلط کیا۔ ذرا دیر بعد ایک لمبا سانس لے کر کہنے لگی "چلو شام ہوگئی"۔

دونوں اٹھیں پیشوان نے کہا "بغیر جوتے پہنے ہوئے کیونکر چلوگی؟"

پدما نے ہنس کر کہا "اب وہ زمانہ نہیں ہے پیشوان اس وقت سب کچھ کر سکتی ہوں"۔

دونوں گھر سے باہر ہوئیں۔

چھٹا باب — ملاقات

شیلا شام کے وقت چھت پر گھوم گھوم کر موسم بسنت کی فرحت انگیز ہواؤں کا لطف اٹھا رہی تھی اسی وقت اس نے دیکھا کہ دو عورتوں نے اُن کے مکان میں قدم رکھا فوراً ہی اسے پدما کی باتیں یاد آگئیں۔ وہ جلدی جلدی چھت سے اتر آئی۔ آکر اس نے دیکھا "سچ مچ پدما دی آگئی ہے"

پہلی ملاقات سے ہی دونوں کے دل فرط مسرت سے بیخود ہوگئے۔ بیخودی نے زبان پر مُہر لگا دی کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ آنکھیں دل کی بیقراری کا ثبوت دے رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

رونا رنج کی نشانی ہے۔ سب کہتے ہیں۔ مگر یہ رونا رنج کا رونا نہیں تھا۔ انسان

کبھی کبھی خوشی میں بھی رونا آتا ہے۔ یہ رونا بھی خوشی کا رونا تھا۔ اس کا ایک ایک آنسو دریائے مسرت کا گراں بہا گوہر تھا۔ نشۂ محبت سے دونوں کے عضو عضو سرشار تھے۔

ذرا دیر بعد دونوں نے اپنے دل سنبھالے۔ سشیلا نے دیکھا۔ پدما کے حسن کا جلوہ اور بھی نکھر گیا تھا۔ ابھی تک اس کی آب و تاب ویسے ہی چمک رہی ہے۔ بدقسمتی اور غم نصیبی کے بادلوں کا اثر اس پر نہیں پڑا۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی ہے توں توں اس پر شباب کا نکھار آتا گیا ہے۔ اس کا رخ انور پورنماشی کے چاند کی طرح روشن ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ پہلے وہ بہت دبلی پتلی تھی۔ اور اب جسم کس قدر گداز ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ سرور کم ہوا۔ اس وقت پدما کا دکھ اور بدل گیا۔ اس کے چہرے سے پردۂ اطمینان کی جھلک نظر آتی۔ پھر رونے لگی۔ یہ آنسو مسرت کے آنسو نہیں تھے۔ یہ قلب کی ناقابل برداشت تکلیف کے آنسو تھے۔ پدما نے بہت دنوں بعد اپنے شوہر کا گھر پھر دیکھا تھا۔ اگر قسمت نے یاوری کی ہوتی۔ تو وہ اسی گھر میں لطف و محبت کی بلبل بنے اردگرد بیٹ کر اس کے پھولوں کی خوشبو سے اپنے دل و دماغ کو معطر کرتی۔ اس کی خوشیوں کی حد نہ ہوتی۔ اس سے بات چیت کرنے میں شوہر، نند، اور دیگر رشتہ دار اسے آنکھوں پر بٹھاتے۔ شوہر کی خدمت گزاری اور اپنے فرائض کی پابندی۔ پدما کو خود دیکھ کر اسے جو شکوہ کا احساس ہوتا۔ وہی خیالی نقشہ آج تمام تر اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ پدما ابھی انہیں خیالات میں غرق ہو کر دریائے تفکر میں غوطے کھانے لگی۔ اور دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ اس کے دل میں جیسے کوئی چٹکیاں لینے لگا۔ سوچتے سوچتے اس کا دل بھر آیا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سی جنبش سے چھلک پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ اپنا منہ آنچل سے ڈھانپ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔ کتنی باتیں ہوئیں اس کا حساب نہیں۔ بیگم کاوتی کے لاپتہ ہونے کے بعد سے بھائی پر کیا کیا گذری سشیلا نے یہ تمام باتیں کہہ سنائیں۔ پدما نے بھی ایک دو باتیں چھوڑ کر اپنی زندگی کے تمام واقعات کہہ سنائے۔ سشیلا نے کہا تم اتنے دنوں سے یہاں ہو۔ پھر مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟

ایک سرد آہ بھر کر پدما نے کہا۔ اطلاع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مگر کیا میرا منہ اس قابل

سے باقی دن اچھی طرح بسر ہوں۔ اور پھر باپ کا اثر بڑے سوچ کر دو میری تو یہی خواہش ہے کہ جس طرح حیثیت کے مطابق اشتہ ولشٹ وتی ہو۔ اب بھی نہ ہو۔ اگرچہ خواہ اونچی نہیں نہ بنے۔ اس سے خود اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو لیکن کبھی کبھی ملنے جلنے سے تسکین تو ہوتی رہیگی۔

بہت دیر تک کچھ سوچ کر پدما نے کہا جھک مار کر وہی کرنا پڑیگا۔ اس سے بہتر اور میرے لئے کیا ہو سکتا ہے؟

عین اسی وقت پیش دان نے کہا۔ رات بہت جا چکی ہے۔

یہ سن کر پدما نے شیاما کی جانب اپنی نگاہیں پھیریں۔ شیاما نے کہا۔ رات بہت جا چکی لوگ بیدار ہو گئے ہیں تمہیں چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔

پدما۔ تمہارے مشورہ کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اب پست آرام نہ چھوڑونگی۔ یہاں رہ کر روز ملونگی۔ اور اسی طرح زندگی کے دن کاٹوں گی۔

آنکھوں میں آنسو بھر کر پدما رخصت ہوئی۔ شیاما نے مجبوراً اسے رخصت کیا۔

چیش دان کے سوا اور کوئی خادمہ وغیرہ ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس وجہ سے شیاما نے اپنی ایک نوکرانی اس کے ساتھ کردی۔

تقریباً رات کے دس بجے تھے۔ چاروں طرف چاندنی صاف شفاف روئی کی طرح چٹکی ہوئی تھی۔ قدرت نے ایک صاف شفاف چادر سی اوڑھی تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسی رات کے وقت پدما حسرت آمیز نظروں سے ستاروں کی طرف دیکھتی ہوئی اپنے شوہر کے گھر سے باہر چلی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی شیاما برابر اسے دیکھتی رہی آنکھوں کے اوٹ ہوتے ہی شیاما نہ معلوم کیا سوچتے سوچتے گھر کے اندر چلی گئی۔

سپٹت گرام میں جہاں بازار لگتا تھا۔ اُس سے تھوڑی دُور پر ایک بڑا میدان دکھائی پڑتا تھا چاروں طرف ہری ہری گھاس تھی۔ بیچ بیچ میں ایک دو ٹیلے پیپل اور بڑ کے عالیشان درخت دکھائی پڑتے تھے۔

اِسی میدان کے ایک کونے میں دو نوجوان ٹہل رہے تھے۔ اُن دونوں میں سے ایک نوکمار تھے۔ اور دُوسرے اُن کے دلی دوست اُماپت چترویدی تھے۔ نوکمار سکھ دُکھ میں برابر اُماپت کی صلاح سے کام لیا کرتے تھے۔ دونوں کی طبیعت بالکل ایک طرح کی واقع ہوئی تھی۔ دونوں نہایت ہی سادہ مزاج مختلف علوم و فنون کے ماہر اور عالم شخص تھے۔ اِن کا تعلق گہرا تھا۔ تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ اُماپت سپٹت گرام کے ہی رہنے والے تھے۔ بچپن میں ہی اُن کے ماں باپ مر گئے تھے۔ اُن کی جائداد اُماپت کے گذارے کے لئے کافی تھی۔ اِس وقت اُن کی عمر چھبیس برس کے قریب تھی۔ اِس تھوڑی سی عمر میں ہی اُنہوں نے مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

اُماپت بہت خوبصورت شخص تھے۔ بھورے کالے بال جسم کی ساخت نہایت ہی سڈول بڑی بڑی آنکھیں چمپئی رنگت۔ تمام بدن جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور بے ساختہ اپنی طرف دل کو کھینچتا تھا۔

نوکمار کا ہاتریوں کی کشتی سے اُتر کر بستی میں جانا۔ کپالی سے ملاقات۔ کپال کنڈلا کے ذریعہ اُس کی مدد سے جان بچانا۔ اُس کے ساتھ شادی اور بیوی کو ساتھ لے کر دیس کی واپسی۔ بیچ میں لطف النساء سے ملاقات۔ لطف النساء کا سپٹت گرام میں آنا اور نوکمار کے ساتھ تعلق و رشتہ کا اظہار۔ کپالی کی آمد اور اپنے خوشنما مکان کا اہتمام۔ پدماوتی کی کوششوں سے کپال کنڈلا کے چال چلن میں نوکمار کو شبہ۔ اور اُس شبہ کے رفع ہوتے ہی یکا یک گنگا میں گر کر کپال کنڈلا کا لاپتہ ہو جانا وغیرہ تمام باتیں اُماپت کو معلوم تھیں۔ نوکمار کی خراب حالت دیکھ کر وہ ہمیشہ دُکھی رہتے تھے۔

اور ہمیشہ وہ اسی کوشش میں رہتے تھے۔ کہ کسی طرح ان کا دُکھ دُور ہو۔ مگر ابتک اُنہیں اسمیں کامیابی
نہ حاصل ہوئی تھی۔ نوکمار کا دل مرن مکتی کیساتھ ہی گنگا میں ڈوب گیا تھا۔ صرف جسم باقی تھا۔ اُس
پر نصیحت کا اثر ہو کر اچھے ہونے کی اُمید کرنی فضول تھی۔ یہ بات اُماپت خوب سمجھتے تھے۔ تاہم
اس خیال سے کہ متواتر کوشش کرنے پر شاید کچھ اثر ہو۔ اور وہ راستہ پر آجائیں وہ کبھی پہلوتہی
نہ کرتے تھے۔ ازسرنو شادی کرکے دُنیادار ہونے کیلئے وہ بہت اصرار کرتے تھے۔ مگر اب تک نوکمار
پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

آج نوکمار نے اُماپت سے پدماوتی کیساتھ پھر گنگا کے کنارے ملاقات ہونے کا ذکر کیا۔ دونوں
ان دونوں کے درمیان جو جو باتیں ہوئی تھیں۔ اور اِس بارہ میں شیاما کی جو رائے تھی۔ ان سب کا
تذکرہ من و عن کیا۔ بہت دیر تک کچھ سوچ کر اُماپت نے کہا۔ بھائی نوکمار! پدماوتی کے دلی ارادہ
سے واقف ہو۔ پدما پہلے بالکل پاپن تھی۔ تو بھی اس وقت اُس کا دل ہر طرح سے پاک ہوگیا
ہے۔ مجھے اس میں کسی قسم کا شک نہیں معلوم ہوتا۔

نوکمار نے کہا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ پدما کے دل میں اس وقت خاص قسم کی تبدیلی آگئی ہے
گذشتہ باتوں پر اُسے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ پچھلے پاپوں کا وہ پراشچت کرنے پر آمادہ ہے۔
وہ اس وقت صرف رحم چاہتی ہے۔ شوہر سے بھیک مانگتی ہے۔ اسی لئے اُس نے آگرے کے
تخت و تاج پر لات مار دی ہے۔ اُس کی دلی حالت دیکھ کر رحم ضرور آتا ہے۔ مگر ایک بات کی وجہ سے وہ
ہمیشہ میری نگاہ میں قصوروار ٹھہرتی رہیگی۔ پدما ہی مرن مکتی کی ناگہانی موت کا باعث ہے۔ اسی نے
بھیمن کا بھیس بنا کر مرن مکتی کے متعلق میرے دل میں شک پیدا کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ان
تمام دل خراش واقعات کا ظہور کیونکر ہوتا؟ اسی نے تو کپالک کیساتھ مل کر یہ تمام پیچ رچا۔
بھائی! تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ میرے کلیجے میں یہ واقعہ ہر وقت تیر کی طرح چبھا کرتا ہے۔

اُماپت نے کہا۔ نوکمار! تم نے جو کچھ کہا۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ میں بھی یہ مانتا ہوں کہ اس معاملہ
میں پدماوتی کا بھی قصور بہت ہے۔ مگر ذرا غور تو کرو کہ کس کا قصور زیادہ ہے۔ تمہاری عقل پر
پردہ پڑ جانے کا بھی قصور ہے۔ کپالی کی دی ہوئی شراب پینے سے تم مدہوش ہو گئے تھے۔
بُرے بھلے کی تمیز جاتی رہی۔ اور تم کپالی کو ہی اپنا اشٹ دیوتا سمجھنے لگے۔ اُس کی تمام باتوں

سامنے جو کوٹھا دکھائی پڑتا تھا۔ وہی پدماوتی کا مکان تھا۔ اسی کے ایک کمرے میں ایک نوجوان پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت عورت نوجوان کے پاؤں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے پاؤں دھو رہی تھی۔ یہ نول رام اور پدماوتی تھے۔

نول رام نے پدما کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ پدما کی آنکھوں کے آنسو اُس وقت بھی کم نہیں ہوئے۔ آنچل میں منہ چھپا کر وہ اسی طرح روتی رہی۔

آنسوؤں کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ نول رام نے کہا۔ پدما! رونا دھونا بیفائدہ ہے۔ ناحق رو رو کر اپنے آپ کو کیوں پریشان کرتی ہو۔ جو ہونا تھا۔ ہو گیا۔ اب اس کا رنج لاحاصل ہے۔ آئندہ کی نسبت فکر کرو۔ تاکہ پھر دکھ نہ اٹھانا پڑے۔ اس کی فکر کرو۔

ذرا دل کو سنبھال کر پدما نے کہا۔ ناتھ! تمام تدبیریں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اس داسی کی زندگی تمہارے قدموں میں پڑی ہے۔ جی میں آئے۔ زندہ رکھو۔ جی میں آئے۔ مار دو۔ اس کے لئے مجھے اور دکھ نہیں ہوگا۔ امید تھی۔ اس پاپی زندگی میں ایک بار آپ کا درشن کر کے اپنے تمام پاپ دھو ڈالوں گی۔ آج وہ امید بر آئی۔ اب زندگی کی خواہش مجھے نہیں ہے۔ اب موت سے نہ ڈروں گی۔ موت آنے پر خوشی سے اس کا خیر مقدم کروں گی۔ اگر تم پوچھو کہ میں روتی کیوں ہوں؟ تو اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ ناتھ! آج پہلے پہل تمہارے قدموں کے نیچے جگہ پاکر جیسا سکھ میں نے پایا ہے۔ ویسا سکھ زندگی بھر میں کبھی نہیں پایا تھا۔ جو سکھ میٹھے سب سے بڑھ کر جان پڑتا ہے اور بعد میں زہر کی طرح پھیل رہتا ہے میں اسی سکھ کی امید میں پاپ ساگر میں ڈوب گئی تھی۔ اب دیکھتی ہوں۔ شوہر کے قدموں میں جو سکھ عورت کو ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ سکھ کیسا قابل نفرت ہے۔ کیسا بے بنیاد

ہے! ہائے ہائے! میں نے اسی سکھ کے سراب میں چکر کھا کر اپنی زندگی خاک میں ملا دی۔ لیکن پران
دونوں آنکھوں کو تجلی دے بیٹھی۔ ناتھ! میں یہی سوچ کر رو رہی ہوں۔ میں نے یہ پاپی جسم کبھی کا
غارت کر دیا ہوتا۔ مگر جس امید سے آج تک ایسا نہیں کر سکی تھی۔ وہ امید آج پوری ہوگئی۔ اب
مجھے دوسری امید نہیں ہے۔ آج جو سکھ میں نے تم سے پایا ہے وہی سب کچھ ہے۔ اس سے
زیادہ اور کچھ نہیں چاہتی۔

اس قدر کہنے کے بعد پدما اور کچھ نہ کہہ سکی۔ مسرت سے۔ رنج سے۔ دلی دکھ کے احساس
سے اس کے دل میں ایک ناقابل برداشت سوئی سی چبھنے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں اس قدر خیالات
کی لہریں اس کے دل میں موجزن ہوتی تھیں کہ وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ ایسی دلی تکلیف
بڑی بڑی عورتوں کے لئے بھی ناقابل برداشت تھی نہ کہ پدما جیسی نازک مزاج عورت کیلئے؛
پدما کا گلا بھر آیا۔ سر چکرانے لگا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر سنبھل نہ سکی۔ ہوش
و حواس جاتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس کے بدن کا تمام بار نوکمار پر پڑا۔ نوکمار نے پدما کو اٹھانے
کیلئے اپنے ہاتھ پھیلائے۔ دیکھا کہ وہ بیہوش ہے۔ ناگہاں اس قسم کی حالت دیکھ کر نوکمار نے
داسیوں کو بلایا۔ وہ فوراً پانی اور پنکھا لیکر آ پہنچیں۔ اور ہوا کرنے لگیں۔ نوکمار نے بھی اسے
ہوش میں لانے کی بڑی کوششیں کیں۔ مگر پدما کو ہوش نہ آیا۔ نوکمار کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں
آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار رواں ہوئی۔ بہت دیر بعد پدما نے ایک لمبا سانس لیا۔ نوکمار
کی جان میں جان آئی۔ رفتہ رفتہ پدما کے ہوش و حواس درست ہونے لگے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ جیسے عضو عضو میں خون کا ایک دریا متموج خیز ہے۔ گال سرخ ہو رہے تھے۔ اور ان
کی سرخی شفق کی سرخی کو مات کر رہی تھی۔ جب پدما نے آنکھیں کھولیں۔ تو نوکمار کی خوشی کا کوئی
ٹھکانا نہیں رہا۔ اس کی طرف سے جو میل دل میں آگیا تھا۔ وہ سب کا سب دھل گیا۔ اور اب
ان کے دل کا شیشہ بالکل صاف شفاف ہو گیا تھا۔ وہ مظلومانہ لہجہ میں کہہ اٹھے۔ پران پیاری!
میں نے تمہارے ہزاروں قصور معاف کئے۔ پیاری! تم عورتوں میں ایک گراں بہا رتن ہو جسے
نے تمہیں [illegible] دیا ہے۔ دنیا مجھ سے چھوٹے۔ تو چھوٹ جائے جس کے جی میں آئے
سمجھے لیکن میں آج صاف صاف کہتا ہوں۔ تم میری بیوی ہو تمہیں [illegible] میں نہ چھوڑونگا۔

محبت ہے۔ دن بدن اور دم بدم بڑھتی ہے۔ پیار کرنے والا صرف اسی قدر جان سکتا ہے کہ وہ
اُسے پیار کرتا ہے۔ اُس کی محبت کس درجہ پکی ہوئی ہے۔ یہ اُس وقت اُسے نہیں معلوم ہوتا
مگر یکایک اُس سے جُدا ہو جانے کے اُس وقت رنج و غم سے متاثر ہو کر دل اِس بات کو محسوس
کرتا ہے کہ اُس کی محبت اور اُس سے پیار کا معیار کیا ہے۔ اسی اصول کے بموجب توکما بھی اپنی محبت
کا اندازہ نہ لگا سکتے تھے۔ مگر جب پدما جدا ہوئی۔ اُس وقت کی جدائی نے انہیں بے حال کر دیا۔

جو توکما کچھ دن پیشتر پدماوتی سے جہاں تک ہو سکتا تھا۔ نفرت کرتے تھے۔ قسمت
سے بنتے رنگ دکھانے والے وقت نے اُن کی دل کی حالت یکدم تبدیل کر دی۔ نفرت
رغبت میں تبدیل ہو گئی۔ اُن کا دل یکایک پدما کی جانب کھنچنے لگا۔ وہی توکما جو اس وقت
تک پیچھے پڑ رہے تھے۔ اُس کے لئے عزیز و اقارب برادری سماج بھائی بند سب کو چھوڑنے
کے لئے تیار ہو گئے۔ اے وقت! تیرا اپنا رنگ ہے۔ تو حقیقت ہے۔

کپال کنڈلا: (برن منی) اس وقت تم کہاں ہو؟ اتھاہ پانی میں ڈوب گئی ہو۔ اس وجہ
سے دیکھ نہیں سکتیں؟ ایک دن اُپیاکی کے جولنے کے دام سے جسے تم نے بچایا تھا۔ وہی احسان
فراموش ایک مرتبہ نہیں اپنا دل بجھو بیٹھا۔ آج پکے اُسکے حوالے کر رہا ہے۔ فی الحقیقت کیا توکما
پدما کی محبت کے دام میں پھنس کر کپال کنڈلا کو بھول گئے۔ نہیں کبھی نہیں! عاشق و معشوق
کے دلوں کے آسمان میں پورنماشی کا چاند آب و تاب سے چمکتا رہتا ہے۔ یکایک تھوڑے عرصے
کے لئے رنج کے بادل گھیر لیتے ہیں۔ اور دنیا کو تیرہ و تار بنا دیتے ہیں۔ ذرا دیر میں بادل پھٹ جاتے
ہیں اور چاند پھر اپنی آب و تاب سے جلوہ فگن ہو کر تمام دنیا میں اپنا نور برسا دیتا ہے۔ چاند اور
تاروں کی یہ سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ جب تک بادل رہتے ہیں۔ تب تک کیا چاند تارے اپنا کام
بند کر دیتے ہیں۔ نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ توکما
کے دل کی حالت بھی بعینہٖ اسی قسم کی تھی۔ برن منی پورنماشی کے چاند کی طرح اُن کے آسمان
دل پر چمک رہی تھی۔ یکایک پدماوتی کی محبت کے بادلوں نے وہ چاند چھپا دیا۔ جب تک یہ بادل
رہیں گے۔ اُس وقت تک چاند چھپا رہیگا۔ صرف اسی قدر! مگر عشق کا کام نہ بند ہوگا۔ وہ
بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کی مانند نظر نہ آنے والے جذبات کی طرح رہکر اپنا کام کریگی۔

نوکمار اور پدما دُنیا و مافیہا کو بھول کر محبت کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے
اسی وقت ایک غیر معمولی واقعہ نے اُن کی خوشی کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ نوکمار نے سُنا
کہ دوسرے مکان سے آنا پت اُن کو بُلا رہے ہیں۔ یہ سُنتے ہی پدما نے فوراً اُن کے گلے سے
اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ عین اسی وقت پیش دان نے آکر کہا۔ کسی بہت ضروری کام کے لئے
کوئی شخص آپ کو بُلا رہا ہے۔ نوکمار گھبرا کر پدما سے رخصت ہو چلے۔ پدما نے اور کوئی تدبیر
نہ دیکھ کر اُن کو رخصت کیا۔ چلتے وقت عاجزانہ انداز سے بولی۔ ناتھ! داسی کو بھول نہ
نہ جائیگا۔ یہی التماس ہے۔

نوکمار پدما کو سمجھا بُجھا کر فوراً باہر آئے۔

پدمنی کے سُکھ کا سُورج طلوع ہوتے ہی وقت آنے سے پیشتر ہی مایوسی کے سمندر
میں غروب ہو گیا۔ بڑی جانفشانیوں اور عرق ریزیوں سے جس اُمید کے موتیوں کے
دانے چُن کر اُس نے ایک لڑی میں پروئے تھے۔ وہ یک بیک بکھر گئے۔
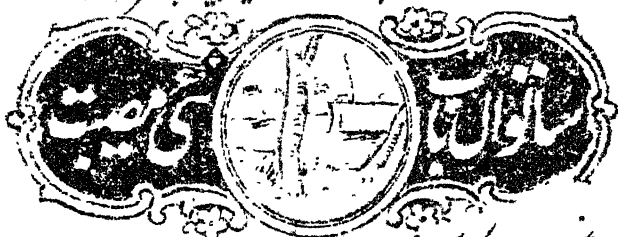
نوکمار نے باہر آکر دیکھا۔ آنا پت وہاں نہیں ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ
آگے بڑھ گئے ہیں۔ گھبرائے ہوئے نوکمار گھر آئے۔ وہاں آنا پت سے ملاقات ہوئی۔ اُنہیں
غمگین دیکھ کر نوکمار نے پوچھا۔ بھائی کیا ہوا؟ مجھے کیوں بُلانے گئے تھے؟ اُداس کیوں ہو؟
آنا پت نے کہا۔ تمہیں بُلانے گیا تھا۔ اس کا خاص سبب ہے چلو۔ بتاتا ہوں۔
دونوں اندر گئے۔ بیٹھنے کے بعد آنا پت نے کہا تھوڑی دیر ہوئی۔ نو دیپ سے خبر آئی
ہے۔ کہ تمہارے بہنوئی منتھر ناتھ بہت بیمار ہیں۔ ذرا یہ خط تو دیکھو۔ اب اس وقت کیا
کرنا چاہئے۔ اس بارہ میں صلاح کرنے کے لئے تمہیں بُلانے گیا تھا۔ اتنا کہکر آنا پت

خط نوکمار کے ہاتھ میں دے دیا۔ نوکمار پڑھنے لگے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں بیمار ہوں۔ اس مرض سے نجات پانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ آخری بار آپ اور اپنی بہن کا درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کچھ دقت نہ ہو تو خط پاتے ہی آپ دونوں آجائیے۔ اور کیا لکھوں۔ بہت تکلیف سے اس قدر لکھ سکا ہوں"

خط پڑھتے پڑھتے نوکمار کی آنکھیں بھر آئیں جب خط پڑھا جا رہا تھا۔ اس وقت آڑ میں کھڑی ہوئی شیاما بھی سب سن رہی تھی۔ مگر روئی نہیں۔ بہت رنج میں آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ شیاما کے دل میں جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ اماپت سے بچھڑ کر رہ چکی تھی۔ اسی وجہ سے اس وقت اس کی آنکھوں میں آبدار موتیوں کی بجائے لعل یمن کا جلوہ تھا۔

اماپت:- بھائی! اداس نہ ہو۔ تحمّل سے جو کرنا ہو کرو۔

نوکمار:- جانا ہی مناسب ہے۔

اماپت:- میری تو یہ رائے ہے۔ کہ کھانا کھا کر آج ہی تم لوگ نودیپ روانہ ہو جاؤ۔

نوکمار:- ہاں یہی مناسب ہے۔ ابھی وقت کوئی کشتی ٹھیک کرنی چاہئے۔

اماپت:- میں کشتی ٹھیک کرتا ہوں۔ تم لوگ جلد کھا پی لو۔

اتنا کہکر اماپت چلے گئے۔ نوکمار اور شیاما جلد کھا پی کر تیار ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں اماپت بھی کشتی ٹھیک کر کے آگئے۔ نوکمار اور شیاما دونوں روانہ ہوئے۔ اماپت کشتی تک ساتھ گئے۔ رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔ نوکمار! مفصل خط بہت جلد لکھنا۔

نوکمار نے "اچھا" کہکر اماپت کے کان میں کہنے لگے۔ اگر ممکن ہو۔ تو پدماوتی کو بھی یہ خبر دے دینا۔

اماپت نے کہا۔ "اچھا"۔ نوکمار، شیاما اور نودیپ سے خط لیکر جو شخص آیا تھا۔ اور ایک نوکر یہ سب کشتی پر سوار ہوئے کشتی آہستہ آہستہ سیت گرام چھوڑ چلی۔

یہاں ناظرین کو شیاما سندری کی سسرال کے کچھ حالات بتا دینے ضروری ہیں جس وقت شیاما آٹھ برس کی تھی۔ اسی وقت اس کی شادی نودیپ کے شری پت مکھو[illegible]

پھر وہ بیاہ ہو گئی تھی۔ اس وقت متھرا ناتھ کی عمر چودہ برس کی تھی۔ متھرا ناتھ کے باپ کو اپنے خاندان پر بہت ناز تھا۔ انہوں نے شیاما کے ساتھ شادی ہو جانے پر متھرا ناتھ کی دو شادیاں اور کی تھیں۔ شیاما دیر تک شخص کی لڑکی تھی۔ اس کے کسی بات کی تعریف نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بات متھرا ناتھ کے باپ جانتے تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے شیاما کو اپنے گھر نہیں بلایا۔ بیچ بیچ میں متھرا ناتھ اپنی سسرال میں آتے جاتے تھے۔ متھرا ناتھ کی اور دونوں بیویاں ان کے گھر پر ہی رہتی تھیں۔ ان دونوں عورتوں کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس پر سوتن کا رشتہ۔ وہ دن رات آپس میں لڑائی جھگڑا کیا کرتی تھیں۔ منجھلی بیوی کو مرے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ ان کی تیسری بیوی کا نام کمدنی تھا۔ کمدنی دیکھنے میں بہت خوبصورت تھی۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ بڑی اچھی ونتی تھی مگر جو اوصاف شیاما میں تھے۔ ان کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ متھرا ناتھ کو شیاما کی خوبصورتی بھی نہ بھولتی تھی۔ وہ کچھ ایسے مالدار شخص نہیں تھے۔ باپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے جس سال ان کی منجھلی بیوی مری تھی۔ اسی سال ان کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد ان کو اتنی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اب تک شیاما سے نہ مل سکے۔ جب ایک بیمار پڑے تو شیاما کے دیکھنے کے لیے وہ بہت بے چین ہوئے۔

اس کے علاوہ متھرا ناتھ کے خاندان میں ان کی ایک بیوہ ماں تھی۔ جب شیاما بالکل کمسن تھی۔ اس وقت انہوں نے اسے ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ دو ایک دفعہ دھوپ آئے تھے متھرا ناتھ کی ماں انہیں بہت پیار کرتی تھیں۔ متھرا ناتھ خود بھی بہت اچھے شخص تھے۔ وہ پڑھے لکھے شخص تھے۔ اس کے علاوہ ان کی طبیعت نہایت رنگین اور با مذاق واقع ہوئی تھی۔

دیکھ کر ایک ہی وقت میں کشش اور خوف دونوں دِل پر اثرانداز ہو رہے تھے ॰

ٹھیک اِسی وقت اِس راستہ سے ایک نوجوان جاتا ہُوا دِکھائی دیا۔ ایسے وقت اِس خوفناک جنگل سے گزر کر یہ نوجوان تنہا کیوں جا رہا تھا جس راستے میں سوائے خوف و خطر کے انسان کے قدم تک کا سُراغ نہیں ملتا۔ اُس راستے میں شام کے وقت تن تنہا شخص، نوجوان تیزی سے قدم بڑھاتا ہُوا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی نظر کسی طرف نہیں تھی۔ یکایک وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس کے کانوں میں کوئی آواز سنائی دی۔ وہ سُننے کیلئے ہمہ تن اُسی میں محو ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ آواز عورت کی سی تھی۔ نوجوان متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایسے خوفناک بیابان میں کسی عورت کے رونے کی آواز سُن کر کون خاموش رہ سکتا تھا؟ وہ آواز کے رُخ کا اندازہ کر کے اُسی طرف بڑھتا گیا۔ جلدی جلدی گھبراہٹ میں چلنے کی وجہ سے ٹانگوں میں جھاڑیوں کے کانٹے چُبھ گئے تھے۔ بعض بعض مقامات سے خون بھی نکلنے لگا تھا۔ ذرا دیر میں تمام بدن لہولہان ہو گیا۔ مگر اِس طرف اُس نے توجہ بھی نہیں دی۔ ذرا دیر بعد وہ وہاں ہی پہنچ گیا۔ جہاں سے آواز آتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے ایک خوفناک نظّارہ دیکھا جس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اُس نے دیکھا کہ ایک بھیانک صورت شخص ایک نوجوان مگر خوبصورت لڑکی کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ لڑکی رو رو کر اُس کے پاؤں پڑ رہی تھی منت سماجت کر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں رو رو کر مدد کی پکار مچا رہی تھی مگر وہ بدبخت اُس کی اِس لجاجت بھری تقریر پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اُسے طرح طرح کے لالچ دے رہا تھا۔ ایسی پُرسوز اور فضول باتیں کسی ٹھنڈے خون والے شخص کے خون میں بھی گرمی پیدا کر دیتیں۔ عورت کی بار بار اِلتجا سے اُسے رحم نہیں آتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ بغیر عورت کا مُنہ بند کئے ہوئے میرا مطلب حل نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ لڑکی کا گلا بند کرنے کی فکر کرنے لگا۔ نوجوان اپنے آپ پر ضبط نہ کر سکا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ اِسی کے بھروسہ پر وہ آگے بڑھا۔ اور ایسا کھینچ کر ہاتھ چلایا کہ لاٹھی چکنا چور ہو گئی۔ اُس کے سر پر زخم کاری لگا۔ خون کا فوارہ جاری ہُوا۔ مُنہ سے آواز تک نہ نکلی۔ نوجوان نے اُسے سوچنے وچارنے کا موقع نہیں دیا۔ فوراً چھاتی پر چڑھ بیٹھا ॰

لڑکی بیچاری ابھی تک پیپل کے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ نوجوان نے اُس کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ فوراً ہی لڑکی نے اپنا سر نیچا کر لیا۔ اور رونے لگی۔ نوجوان نے دیکھا۔ لڑکی غیر معمولی طور پر حسین ہے۔ اُس کی نگاہوں میں ایسا حُسن والا پہلے کبھی نہیں گذرا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ بولا۔ اے لڑکی کیوں ہو؟ کانپنے کی کیا وجہ ہے؟ اگر کوئی حرج نہ ہو۔ تو اپنا پتہ دو۔ میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ موقع غنیمت سمجھ کر اُس نوجوان کے پنجہ سے وہ ظالم آزاد ہونے کی فکر کرنے لگا۔ بادل کی طرح گرج کر نوجوان نے کہا۔ دُشٹ! کھڑا رہ!! ابھی تیرا قلع قمع کرتا ہوں۔

اتنا کہکر نوجوان نے زور سے اُس کے پاؤں کس کر باندھ دئے۔ اس کے بعد ہاتھ باندھ کر پاس کے ایک درخت سے اُسے باندھ دیا۔

لڑکی بیٹھی ہوئی نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جیسے خمار بھرا ہوا تھا۔ تکلّف سے پاک حُسن قدرتی آرائش کی شان دکھا رہا تھا۔ وہ دیر تک نوجوان کو دیکھتی رہی۔ اُس وقت لڑکی کی آنکھوں میں سچ مچ تقدیس کا دریا موجزن تھا۔ لڑکی کے منہ پر کسی قدر کپڑا سرک کر آگیا تھا۔ مگر پھر بھی جیسے چاند پردہ ابر میں چھپ کر جگمگاتا رہتا ہے۔ اسی طرح اُس کا حُسن کپڑے کی آڑ میں بھی نور برسا رہا تھا۔

لڑکی کی نگاہیں برابر اُسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اتنے میں نوجوان اُسے باندھ کر اُس کے پاس آیا۔ لڑکی نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نوجوان نے کہا۔ خوف کی بات اب کوئی نہیں۔ پھر کیوں ڈرتی ہو؟

لڑکی نے جواب نہیں دیا۔ نوجوان نے پھر دریافت کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے نہایت مختصر طور پر آہستہ آہستہ شیریں مگر کانپتی ہوئی آواز میں ڈر سے ڈرتے اس واقعہ کا ذکر کیا۔

نوجوان نے چونک کر پوچھا۔ میں اس وقت کہاں پہنچا ہوں؟ کہہ سکتی ہو! کونسی جگہ ہے؟

لڑکی۔ ہمارا گھر گوپال پور میں ہے۔

نوجوان۔ گوپال پور کیا؟ وہاں تو میں کبھی آیا جایا نہیں ہوں۔ کیا تم اپنے باپ کا نام بتا سکتی ہو۔

لڑکی۔ کالی دلس چٹوپادھیا۔

نوجوان پھر چونک اُٹھا۔ اور تحیرانہ انداز سے بولا "ایشور کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں وقت پر آگیا بھگتی چاریہ مہاشے سے میں بخوبی واقف ہوں۔ تم انہیں کی لڑکی ہو؟ تمہیں تو میں نے کبھی نہیں دیکھا"

تحتیہ آسمان پر دوج کا چاند اس وقت اپنا سونے کا رتھ چلا رہا تھا۔ شوہر کی جدائی میں ناقابل برداشت مصیبت اُٹھائی ہوگی۔ یہ سوچ کر تاروں کی قطار رتھ کو چاروں طرف سے گھیر کر گویا "کہاں جاتے ہو؟ کہاں جاتے ہو" کہتے ہوئے ساتھ جا رہی تھی۔ زمین مسکرا رہی تھی۔ ہر چہار طرف نور کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر مینڈک وغیرہ چلا اُٹھتے تھے۔ گمان ہوتا ہے۔ رات کی ایسی فضا اور چمک دمک دیکھ کر انہیں دن کا گمان ہوتا تھا۔ شاید شام کی تاریکی کے ساتھ اُفق کا جلوہ دیکھ کر سب شور مچا رہے ہیں۔

نوجوان نے کہا۔ اب دیر نہ کرو۔ رات بہت گذر گئی ہے۔ چلو! تمہارے باپ کے پاس پہنچا دوں۔ لڑکی نے بھی اسے منظور کیا۔ دونوں روانہ ہوئے۔ نوجوان آگے آگے تھا۔ اور لڑکی پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ اس گنجان جنگل میں چھپ گئے۔

کیا ناظرین نے جانا کہ یہ نوجوان کون تھا؟ یہ ہمارا جانا پہچانا اُوپت تھا۔ گوپال پور میں اُوپت کا ننہال تھا۔ اسی وجہ سے وہ وہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ آج کسی خاص کام کی وجہ سے اس طرف جا رہا تھا۔

گوپال پور میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ نیند کی گود میں آرام کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں بھر میں صرف ایک ہی گھر تھا جس کے تمام آدمی جاگ رہے تھے۔ مکان بظاہر دیکھنے میں کسی دولتمند کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن نہایت صاف ستھرا تھا۔ اندر صرف چار ہی کمرے تھے۔ سامنے صحن تھا گو وہ بہت بڑا نہیں تھا۔ مگر کھلا ہوا تھا۔ دوسری

طرف پھوس کا ایک جھونپڑا تھا۔ اندر ایک کونے میں چراغ جل رہا تھا۔ اس چراغ کی روشنی میں دو شخص بیٹھے ہوئے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اور زار زار رو رہے تھے۔ ان میں سے ایک مرد تھا۔ اور دوسری عورت۔ مرد کی عمر پچاس برس سے کم نہ تھی۔ دوسری اس کی بیوی تھی جس کی عمر لگ بھگ چالیس برس کے قریب تھی۔

مرد نے کہا۔ بتاؤ۔ اب میں کیا کروں؟ جہاں تک ہو سکا۔ تلاش کی۔ اب جو مالک کی مرضی! ایک تو رات کا وقت ہے۔ دوسرے چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ایسے بُرے وقت میں کہاں جاؤں؟ اور جا کر کیا کروں گا؟ بیٹھے بھی نہیں رہا جاتا۔ شہر بھر کے کتنے ہی آدمی تلاش کرنے کے لئے دئے گئے ہیں۔ ان سے زیادہ کیا پتہ لگاؤں گا؟ پھر بھی دل نہیں مانتا۔ ایشور نے ہماری قسمت میں اس قدر دُکھ لکھا تھا۔ اچھا جاتا ہوں۔ عورت نے کہا۔ نہیں۔ تم جا کر کیا کرو گے؟ میں ابھی سوچ رہی تھی۔ کہ جو کچھ قسمت میں تھا۔ وہ ہو گیا۔ ہائے! اب کل صبح میں لوگوں کو کیسے منہ دکھاؤں گی؟"

مرد نے کہا۔ بھگوان! سب تیری ہی مرضی سے ہو رہا ہے۔ سماج میں نکو بنا۔ خاندان میں داغ لگا۔ ایک لڑکی تھی۔ آج اسے بھی کھو بیٹھا۔ تمام تکالیف برداشت کر کے اکلوتی لڑکی کو لیکر میاں رہتا تھا۔ ننگ نا ہنجار سے یہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ بھگوان! اس دُکھی کو اور دُکھ دینے سے تمہیں کیا سکھ ملتا ہے۔ دو۔ جتنا جی میں آئے۔ دُکھ دو۔ میں نے بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ اور بھی بہت کچھ برداشت کر لونگا۔ مگر میری لاڈلی بیٹی نے دُکھ کا نام بھی نہیں سُنا۔ دیا ساگر! کیا اُسے اس قدر دُکھ دینا تمہارے لئے زیب دیتا ہے۔ اپنی بات تو آپ ہی جانو۔ ہائے! نہ معلوم وہ بیچاری کس مصیبت میں پڑی ہو گی۔

عین اسی وقت اُن کے مکان کے پیچھے سے آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ دونوں بے تابانہ نگاہوں سے آنگن کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ رات کی تاریکی کا دامن پھاڑ کر دو کالی صورتیں داخل ہو رہی ہیں۔ دونوں اُس طرف لپکے۔ اور بے تابانہ انداز سے پوچھنے لگے۔ کون؟ ہماری کیشی! اس سوال کا جواب بات سے نہیں دیا گیا۔ جیسے جھبرا کاٹے کو دیکھ کر بکا یک ڈر کر ماں کے پاس دم لیتا ہے۔ اسی طرح

مُکت کیشی دوڑتی ہوئی آکر ماں کے گلے سے لپٹ گئی کھوئی ہوئی لڑکی پاکر جو خوشی ماں باپ کو ہوئی اُس کا اظہار احاطۂ قلم سے باہر ہے۔ دونوں وہاں ہی کھڑے ہوئے دیر تک رنج اور خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔

بالآخر مُکت کیشی نے کہا۔ بابا! انہیں نے آج ہماری جان بچائی ہے۔ یہ کہکر اُس نے اُماپتی کو دکھایا۔

اُماپتی کو دیکھ کر کالی داس بھٹاچاریہ فوراً ہی پہچان گئے۔ اور خوش ہوکر بولے کون؟ اُماپتی!

اُماپتی نے جی ہاں کہکر جواب دیا۔

بھٹاچاریہ بولے۔ اُماپت! اب تک توجہ دوسری طرف تھی۔ تمہیں دیکھا نہیں۔ مجھے کوئی غیر نہ سمجھنا۔ یہ کہکر اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ تم اِن کو نہیں جانتی۔ یہ کوئی اور نہیں ہیں۔ اپنے ہی ہیں۔ میری ہر کے بھا نجے ہیں۔"

اُماپتی نے کہا میں اس وقت جاتا ہوں۔ رات بہت گذر گئی ہے۔ ماما سے بڑا ضروری کام ہے۔

بھٹاچاریہ نے کہا۔ اُماپتی! رات بہت جا چکی ہے۔ یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے؟ آج ہم لوگوں کو جو خوشی نصیب ہوئی ہے سو تمہاری ذات سے اور اس بارہ میں میں تم سے جتنی دیر تک باتیں کرونگا۔ اُسی قدر میری طبیعت خوش ہوگی۔

اُماپتی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ وہ ایک خاص کام سے ماما کے گھر جا رہا تھا۔ راستہ میں اِن مصیبت کا سامنا ہوا۔ اگر بہت ضروری کام نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی اُس خطرناک راستہ میں قدم نہ رکھتا۔ اِس لئے اُماپتی نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر سوچنے لگا۔ کہ مُکت کیشی کو جتنی دیر تک دیکھتا رہوں۔ وہی غنیمت ہے۔ اِس طرح کشمکش میں پڑے ہوئے وہ مُکت کیشی کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھا۔ مُکت کیشی بھی کن انکھیوں سے اُنہیں دیکھ رہی ہے۔ اُماپتی کو معلوم ہوا گویا اُن نگاہوں میں احسان۔ مسرت اور محبت بھری ہوئی ہے۔ اُماپتی سب کچھ بھول گیا۔ اُن کو وہ ضروری کام معمولی معلوم ہونے لگا۔ اس موقعہ پر اگر وہ شاہی تخت بھی پاتے تو نہ قبول کرتے۔

اُماپت نے کہا - اچھا آج یہیں سو جاؤں گا -

اس مرتبہ پھر اُماپت نے مُکت کیشی کے بے عیب حُسن کا نظارہ کیا - اُنہیں معلوم ہُوا
گویا خوشی سے وہ ہنس رہی ہے - اُن کی دلی آنکھ خواہشات کے جوش سے مُکت کیشی کے
مُنہ کو طرح طرح کے خیالات سے پھر تعبیر کرنے لگی - از خود رفتہ اُماپت عالمِ خیال میں قدرت اور
غیر اصلی اور غیر مادی چیزوں کو اصلی اور حقیقی سمجھ کر خوش ہُوا -

خوش ہو کر بھٹاچاریہ اُماپت کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئے - مُکت کیشی اور اُس کی ماں
پیچھے پیچھے چلی چراغ کی روشنی میں سب لوگ مختلف جگہوں میں بیٹھے - مُکتا اور اُس کی ماں ایک
جگہ بیٹھیں - لڑکی نے ماں کے شانہ پر اپنا مُنہ رکھ دیا - اُس وقت بھی مُکت کیشی کبھی کبھی ہچکی
اور تھر تھر کانپنے لگ جاتی تھی - ماں نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ کر اُسے تسلی دینی شروع کی

بھٹاچاریہ نے کہا - بیٹی ! اب کیوں ڈرتی ہو؟ بتاؤ تو سہی کیا ہُوا ؟

اُماپت نے کہا - ہاں ! میں بھی مفصل جاننے کیلئے از بس بیتاب ہوں - جو کچھ سُنا ہے -
وہ بہت مختصر -

مُکت کیشی نے اُماپت کی طرف نظر کی - اور پھر فوراً ہی اپنا سر نیچا کر کے تمام حالات سُنانے
لگی - وہ حالات بہت طویل ہیں - ہم مختصر طور پر اُسے لکھتے ہیں -

مُکت کیشی جیسے ہر روز تیسرے پہر نہانے کے لئے اپنے گھر کے پاس والے تالاب
پر جاتی تھی - اسی طرح آج بھی گئی تھی - اور دن اُس کی ماں بھی ساتھ جاتی تھی - آج کسی خاص کام
کی وجہ سے وہ نہ جا سکی - پڑوس کی عورتوں میں سے کوئی نہ کوئی تالاب پر ضرور رہتی تھی - آج
اُن میں سے بھی کوئی نہ تھی - مُکت کیشی سہمی ہوئی جلد جلد اپنے ہاتھ پاؤں دھو رہی تھی - ذرا
دیر بعد ہی ہاتھ پاؤں دھو کر اوپر آ گئی - اسی وقت پاس کے جنگل سے نکل کر ایک شخص نے چُپ
چاپ آ کر مُکت کیشی کا ہاتھ پکڑ لیا - لڑکی اسے دیکھ کر ڈر کی گھگھی بندھ گئی - اُس کا بھینسے
کا سا بدن - لال لال آنکھیں - ہٹا دھاڑی اور ڈراؤنی صورت دیکھ کر مُکت کیشی تھر تھر کانپنے
لگی - بھاگنا مشکل تھا - کمزور اور نازک بدن لڑکی کیونکر اُس سے اپنا ہاتھ چھڑاتی - رونے چلانے
میں بھی پس و پیش معلوم ہوا - فوراً ہی اُس کمبخت نے کپڑے سے اُس کا مُنہ بند کر دیا - مُکت کیشی

دیکھتے دیکھتے بیہوش ہوگئی۔ اس کے بعد پھر وہ اُسے اُسی جنگل میں لیگیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہاں جاکر اُس نے اُس کے بندھن کھولے تب بھی مکتا بیہوش ہی رہی۔ بہت دیر بعد اُسے ہوش آیا۔ اُس کو اُس حالت میں چھوڑ کر دیوتا تو فاصلہ پر جا بیٹھا۔ مکت کیشی رونے لگی۔

مکت کیشی نے کہا "میرے ماں باپ اتنی دیر تک مجھے غائب دیکھکر کس قدر گریہ زاری کرتے ہونگے۔ ہر چہار طرف تلاش کرتے ہوں گے۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ گھر چلی جاؤں۔ میرے ماں باپ کے میرے سوا اور کوئی نہیں ہے"۔

اس نے ایک بھی نہیں سُنی۔ بلکہ سُن سُن کر ہنسنے لگا۔ طرح طرح کے لالچ دیئے تھے۔ جب اور کوئی اور تدبیر۔ تو مکتا رونے لگی۔ اُس ظالم نے دیکھا۔ کہ بغیر اسے چپ کرائے ہوئے کام نہ چلیگا۔ اس لئے اُس نے مکتا کا منہ کپڑے سے بند کرنا چاہا۔ لیکن اسی وقت ایشور نے مکت کیشی کے دُکھ سے دُکھی ہو کر اُس کی پاک زندگی کی حفاظت کیلئے آپ کو وہاں بھیجا۔ آگے کے حالات ناظرین کو معلوم ہی ہیں۔

بھٹاچاریہ نے کہا بچہ میا! تم سب کچھ کرسکتی ہو۔ آپ میں مفلس و غریب برہمن ہوں کہ کیا ہے تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دُعا کرتا ہوں۔ تم ہمیشہ سُکھی رہو۔ آج جو احسان تم نے کیا ہے۔ اُسے میں زندگی بھر نہ بھُولونگا۔ میں تمہارے باپ کی رعیت ہوں۔ اس لئے میں تم سے علیحدہ نہیں ہوں۔ اچھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ بتاؤ۔

آپ نے مکت کیشی کے بقیہ حالات کہہ سُنائے۔ اب سب باتوں کے ختم ہونے پر پھر طرح طرح کی خوشی کی باتیں ہونے لگیں۔ اور کھانے پینے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے بستر پر گئے۔

اُماپت دکن کی طرف ایک مکان میں سو گئے۔ اُن کے بستر سے ذرا فاصلہ پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ ابھی تک اُنہیں نیند نہ آئی تھی۔ آنکھیں ضرور بند کر لی تھیں۔ مگر نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ طرح طرح کے خیالات میں غرق تھے۔ ایک کے بعد دُوسرا مسرت بخش خیال آتا تھا۔ کسی نیک کام کے انجام دینے کے بعد انسان کے دل میں فطرتاً مسرت پیدا ہوتی ہے۔ آج اُنہوں نے جو کام کیا تھا۔ اُس کے اثر سے اُن کے تمام بدن میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی۔ خوشی سے دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ فکر و تردّد میں صرف ایک ہی غم سے جان پر آبنتی ہے۔ خوشی میں ایسا نہیں ہوتا۔ خوشی میں اُس سے تعلق رکھنے والے مختلف سُکھ دینے والے افکار آ کر دل پر اپنا تسلط کر لیتے ہیں۔

اُماپت بستر پر پڑے پڑے اسی قسم کے خیالات کی لہروں میں ڈُوبتے تیرتے تھے۔ مختلف افکار کے ساتھ ہی ایک مسرت آمیز فکر نے اُن کے دل میں آرزوؤں کا طوفان بپا کر دیا۔ اُس فکر کو دُور کرنے کی اُنہوں نے ہر چند کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اُمیدوں نے دل میں چُٹکیاں لینی شروع کیں۔ ایک نوخیز بھولی بھالی صورت کے تصوّر میں اُماپت کا گیان علم مان وغیرہ سب کا سب اِس کے سیلاب میں بہ گیا۔ وہ بھولی بھالی نوخیز لڑکی مُگت کیشی تھی۔ وہ جُوں جُوں اُس کے حُسن کا تصوّر کرتے تھے۔ تُوں تُوں اُنہیں ایک رُوحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ گھنٹوں اُسی پُر سرور خواب کے مزے لُوٹتے۔ پھر یکایک چونک اُٹھتے۔ کہیں یہ کیا سوچ رہا ہوں کبھی دل ہی دل میں کہتے۔ مُگت کیشی کیسی وسیع خیال ہے۔ وہ دیامئی دیوی ہے جس کم بخت نے اُسے دُکھ دیا تھا۔ وہ اُس پر بھی رحم کرتی ہے۔ مُگت کیشی سنسار کا سار ہے اُس کا دل بیش قیمت اور گراں بہا جواہرات کی کان ہے۔ اُس کا عضو عضو خوبصورتی کا آئینہ ہے

ہی دلفریب دلکش مرقع ہے۔ اس کا روشن چہرہ سرور اور رعانیت کی مجسم تصویر ہے۔ چہرہ کی نورانیت بدر کامل سے بھی زیادہ دلکش اور روح فزا ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں کس قدر دلفریبی ہے۔ اُس کی نظریں اس طرح نور کی بارش کرتی ہیں۔ گویا پورنماشی کا چاندچاندنی پھیلا رہا ہے چنچلے پتلے نازک ہونٹوں پر تبسم نے کیسا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ ایسی تقدیس اور پاکیزگی آنا جی نے کہیں نہ دیکھی تھی۔ اُنہوں نے دُنیا میں کیا دیکھا؟ مُکت کیشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ دُنیا میں کیا اور حسین عورتیں نہیں؟ ممکن ہے مگر مُکتا کی طرح ہے یا نہیں اس میں آنا جی کو شک تھا۔

آنا جی انہیں خیالات میں غرق تھے۔ وہ اس قدر ازخود رفتہ ہو گئے۔ کہ انہیں معلوم ہُوا۔ جیسے مُکت کیشی پاس آ کر بیٹھی۔ اور دلفریب ہنسی ہنستی ہوئی باتیں کر رہی ہے۔ انہیں خیالات کو سوچتے سوچتے انہیں نیند آ گئی۔

نیند میں بھی وہ مُکتا کا خواب دیکھنے لگے۔ وُہی پیارا پیارا چہرہ تھا۔ اور وُہی دلفریب تبسم۔ انہیں ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے وہ عورتوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔ عنبریز ہوائیں چل رہی ہیں۔ اور ان کے جھنکوں سے ایک دلآویز نغمہ کے سُر نکل رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دور پر پہاڑی ندی جھر جھر کرتی ہوئی بلند پہاڑ سے گر کر رواں ہے۔ جہاں وہ بیٹھے ہیں۔ وہ جگہ سانولی سلونی اور نورانی چمک سے بھرپور ہے۔ سامنے ایک پہاڑی سے نکلی ہوئی پتلی دھار سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ اُس کے دائیں طرف سیاہ گھٹائیں سے پیدا ہوئے سانپ اپنا چمکدار سر اُٹھائے تمام دُنیا دیکھ رہے ہیں۔ اُس کی دُوسری طرف طرح طرح کے درخت اور بیلوں سے جنگل بھرپور تھا۔ جنگل میں طرح طرح کی بیلیں۔ درختوں کی شاخوں اور جڑوں سے لپٹی ہوئیں ایک منڈپ سا بنائے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کے خوشنوا پرند نغمہ لطیف کی بارش کر رہے تھے پیچھے ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ جو درخت بڑی کوششوں سے باغ میں نہیں پھلتے۔ وہ اس جنگل میں گونمدی کیطرح لدے ہوئے تھے بھونرے پھلوں کے گرد مست ہو کر جھوم رہے تھے۔ کیسی سُہاونی دلکش جگہ تھی۔ آنا جی کو معلوم ہُوا۔ گویا وہ جگہ قدرت کی نیرنگیوں کا ایک گلبن ہے۔ وہ محو اور بے خود ہو کر خوردے ان پُر لطف نظاروں سے حظ اُٹھا رہے

تھے - دل کھول کر وہ قدرت کی صنعتگری کے گیت گانے لگے - اسی وقت نظر نہ آنیوالے انداز سے پیچھے والے جنگل سے بن دیوی کی طرح مکتا پھولوں سے لدی ہوئی نکلی - آہستہ آہستہ پاؤں آگے بڑھا کر پیچھے سے اُس نے اُماپت کی دونوں آنکھیں بند کرلیں - چونک کر اُماپت نے کہا - "کون ہے ؟"

اُن کی آنکھوں پر سے ہات ہٹا کر دیوی نے کہا "چھی ! تم مجھے پہچان نہ سکے -"

اُماپت نے مسرت بھری نگاہوں سے دیکھا - مکت کیشی ہے - تحیرانہ انداز سے پوچھا - مکتا ! تم یہاں کہاں ؟

مکت کیشی نے کہا ...... "اور تم ؟"

اُما - میں یہاں کی خوبصورتی دیکھنے آیا ہوں -

مکتا - تم یہاں آئے ہو - اور میں تمہیں دیکھنے آئی ہوں -

اُما - تم سے کس نے کہا - کہ میں یہاں آیا ہوں -

مکتا - جس نے کہنا تھا - اُس نے کہہ دیا -

اتنا کہکر مکتا نے اپنے سینہ پر اُنگلی رکھی - اور اشارہ سے بتا دیا - کہ میرے دل نے یہ بات کہی ہے -

اُما - مکت کیشی ! تمہارا لباس ایسا کیوں ہے ؟

مکتا - کیسا لباس ؟

اُما - یہ دلفریب پھولوں کا لباس !

مکتا - کیوں - کیا لباس تمہیں پسند نہیں -

اُما - پسند کیوں نہیں - میں یہ لباس بہت پسند کرتا ہوں -

مکتا - سچ سچ -

اُما - میں تم سے کبھی جھوٹ کہہ سکتا ہوں ؟

"تو ٹھیرو - تمہیں بھی اس لباس سے مزین کردوں" کہکر مکت کیشی پھر اُسی پھولوں کے جنگل میں چلی گئی - اُماپت مکت کیشی کی سادگی اور بھولی بھالی گفتگو پر دل ہی دل میں خوش ہونے لگے -

اتنے میں مُکتا اپنا آنچل پھولوں سے بھرے ہوئے داخل ہوئی۔ پھولوں کو ہری ہری گھاس پر رکھ کر وہ خوش رنگ پھولوں کی پگڑی بنانے لگی۔ جب بن گئی۔ تو اُماپت کے سر پر رکھ کر دیکھا۔ اور پھولوں سے دیگر زیورات سے اُنہیں سجا کر بار بار اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ عالمِ خواب میں پیار و محبت کے یہ کھیل اُماپت کو بہت پسند آئے اور وہ ہمہ تن اس میں محو ہو گئے۔ جب اُماپت خوب زیور سے آراستہ ہو گئے۔ تو مُکت کیشی نے کہا۔ ذرا کھڑے ہو۔ میں دیکھوں تو سہی!

اُماپت کھڑے ہو گئے۔ مُکت کیشی نے دیکھا۔ کچھ کسر ہے۔ بولی۔ چار رنگین پھول اور ہوتے۔ تو کیا اچھا ہوتا؟

ذرا دیر بعد بولی۔ "یہ نقص بھی نہ رہنے دوں گی۔ خواہش پوری کروں گی"۔ اتنا کہہ کر اُس نے اپنے گلے سے ایک خوش رنگ ہار اُتار کر اُماپت کے گلے میں ڈال دیا۔ مُکت کیشی کے اس سلوک سے اُماپت حیران رہ گئے۔

مُکت کیشی یکایک متکبرانہ لہجہ میں بولی۔ رام رام! کیا کیا؟ تم سے بغیر پوچھے ہی تمہارے گلے میں ہار ڈال دیا۔ تم مجھے نہایت شوخ اور چنچل سمجھتے ہو گے۔

اُماپت نے زبان سے اس کا جواب نہ دیا۔ اشاروں میں ہی جواب دینے اور شکریہ ادا کرنے کے لئے سوچنے لگے۔

مگر جونہی وہ اُٹھے۔ اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ جس مکان میں سوئے ہوئے تھے۔ اُس کے دکن کے طرف کی کھڑکی بالکل کھُلی ہوئی تھی۔ صبح کے جس حصہ میں رات اور دن دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رخصت ہوتے ہیں۔ یہ وہی وقت تھا۔ سورج دیوتا پردۂ تاریکی میں چھُپے ہوئے تھے۔ دو ایک کوّے دیواروں پر بول رہے تھے۔ رسوئی خانہ کے کوڑے پر پڑا ایک کُتا سویا ہوا تھا۔ وہ بھی کان پھٹ پھٹا کر اُٹھ بیٹھا۔ بدن کی گرد جھاڑنے لگا۔ دو ایک کیڑے اُسے بہت تنگ کر رہے تھے۔ ایک اُلّو رسوئی خانہ کے چھپر پر بیٹھا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کُتّے کی پھڑپھڑاہٹ سُن کر وہ پاس ہی کے آم کے درخت کی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ شاخ جھُک گئی۔ اور وہ جھُولنے لگا۔

کھڑکی کھُلی ہونے کی وجہ سے نسیمِ سحری کے جھونکے اُماپت کے دل میں ایک گُدگدی سی

سی چینکر رہے تھے۔ اور وہ اپسینہ سے شرابور ہو رہے تھے۔ یکایک اُن کی آنکھ کھُلی متحیرانہ نگاہوں سے وہ چاروں طرف دیکھنے لگے۔ جو دیکھا اُس سے اُن کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔
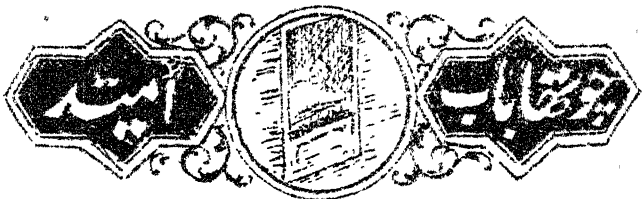
آنکھ کھُلتے پر اُماپت نے دیکھا۔ مکت کیشی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جُونہی انہوں نے آنکھیں کھولیں تُونہی مکتا کی تصویر جھلک دکھائی دی۔ مگر انہیں یقین نہ آیا سو وہ سمجھے میں ابھی تک خواب دیکھ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد شک رفع ہُوا۔ خوشی کی حد نہ رہی۔ مسرت آمیز لہجہ میں بولے۔ مکت کیشی!

مکت کیشی نے شرم سے گردن جھکا لی۔ اور وہاں سے آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی چلی گئی۔ رات کو آرام گاہ میں لیٹی ہوئی نیند کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر نیند کہاں؟ نیند کے عوض اُماپت کے ساتھ رہنے اور اُن سے متواتر بات چیت کرتے رہنے کی خواہش نے اُس کے دل میں ایک تردد کا عالم پیدا کر دیا جس نیک وقت میں اُماپت نے اُس پُرخطر جنگل میں جا کر مکت کیشی کو اُس ظالم کے دستِ تظلّم سے آزاد کیا تھا۔ اُسی وقت سے مکت کیشی کے دل میں اُماپت کے لئے ایک جگہ ہو گئی تھی۔ حُسنِ تقدیر اور حُسنِ اتفاق نے اُسے وہ بے بہا موتی دے دیا تھا۔ جس کے سامنے کسی دُوسرے گوہر کی چمک کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ وہ ہر وقت اُماپت کے تصور میں ہی محو رہتی تھی۔ اور ہر وقت احسان مندانہ نگاہوں سے اُنہیں دیکھتی تھی۔ اگرچہ اِس سے پیشتر مکتا نے کتنے ہی خوبصورت وجیہہ اور خوش رُو نوجوان دیکھے تھے۔ لیکن اِس کے صفحۂ دل پر کسی کی صُورت کا نقش نہیں پڑا تھا۔ اُماپت کے حُسن میں نہ معلوم ایسی کون سی زبردست کشش تھی جو بار بار اُس کے دل کو اپنی طرف کھینچ لے جاتی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت مُسکراہٹ رہتی تھی۔ اور دل مُسرت کے مزے لیتا تھا۔ وہ دل

آنؔ دل میں کہتی تھی۔ کہ اُماپتی کے سوا دُنیا میں اب مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں۔

کون ہے؟ جس کا دل آرزؤں اور اُمیدوں سے خالی ہے۔ تم اگر کسی پر احسان کرو۔ کسی کا بھلا کرو۔ تو وہ ضرور تم سے اظہارِ محبت کریگا۔ تمہارے بار احسان سے اُس کی گردن ہمیشہ خم رہیگی۔ ممکن ہے۔ اِسی وجہ سے مُکت کیشی کا دل اُماپتی کی طرف یکایک کھنچ گیا ہو۔ اِس کے سوا اُماپتی میں کوئی اور عجیب غریب کشش تھی۔ یا نہیں اِس کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اِس کا علم تو صرف اُس ذات پاک کو ہی تھا۔ آخر اُماپتی کب تک اُٹھینگے۔ کانوں میں اُن کے شیریں نغموں سے کب رس ٹپکے گا۔ انہیں دیکھ کر دل پر کب نشۂ اُلفت طاری ہوگا۔ ان خیالات میں تمام رات مُکت کیشی کی پلک سے پلک نہیں جھپکی۔ بہت رات گذر جانے پر ذرا دیر کے لئے مُکتا کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی۔ تو اُس نے دیکھا۔ کہ رات اب بہت تھوڑی باقی رہ گئی ہے۔ جی رہ رہ کر گھبرا رہا تھا۔ کلیجہ یکایک دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ فرطِ اضطراب سے وہ چبوترے کے پاس ٹہلنے لگی جس کمرے میں اُماپتی سوئے ہوئے تھے۔ اُس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ مُکتا کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ وہ ایسی رات میں بھی اُماپتی کو دیکھ سکیگی۔ اس لئے وہ بیدلی سے دُور تک چلی گئی۔ بھُول کر بھی کسی طرف نظر نہ کی۔ واپسی میں کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ وہاں جو نظارہ دکھائی دیا۔ اُس نے جیسے مُکتا کے قدم وہاں ہی جما دئے۔ دبے پاؤں کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر اشتیاق آمیز نگاہوں سے اُماپتی کو دیکھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اُماپتی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مُکتا کی شیریں باتیں سُننے کیلئے از خود رفتہ ہوگیا۔ مُکتا فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔ اُس کی طبیعت وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتی تھی۔ مگر شرم و حجاب نے زبردستی وہاں سے اُس کو ہٹا دیا۔ مُکت کیشی ہار گئی۔ شرم کے ہاتھ بازی رہی۔

اُماپتی مُکتا کے چلے جانے کے بعد سوچنے لگے۔ کہ کیا سچ مُچ مُکت کیشی یہاں آئی تھی۔ اِس وقت وہ یہاں کیوں آنے لگی۔ وہ چُپ چاپ یہاں کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی۔ مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیوں دیکھتی تھی؟ جیسے مُکتا کو دیکھنے کیلئے میرے دل میں آرزو ہے کیا مُکتا بھی مجھے دیکھنے کی خواہشمند ہے۔ ضرور! یہ سوچ کر اُماپتی نے ایک لمبا سانس لیا۔ "اگر خواب صحیح ہو۔ تو میں بڑا خوش قسمت ہوں۔

یہ سوچ کر اُماپتی فوراً باہر آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد اُماپتی بھٹاچاریہ مہاشہ کے پاس آ گئے۔ اور اُن سے اجازت لے کر اپنے ماموں کی گھر کی طرف چلے۔ چلتے ہوئے انہیں مکتا کیشی سے ملاقات کرنے کی خواہش ہوئی۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ مگر وہ ناکام واپس آئیں۔ کاش مکتا کہیں سے ذرا نظر بھی آ جاتی۔ تو کیا وہ سب کے سامنے بات چیت کر سکتے تھے؟ نہیں اُن کی ہمت ہی تقاضا نہ کرتی۔

اُماپتی مایوسانہ صورت بنائے وہاں سے روانہ ہوئے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی انہوں نے دیکھا۔ کہ مکتا کیشی سامنے سے آ رہی ہے۔ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "مکتا! تم کہاں گئی تھیں؟"

مکتا نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہونٹ جواب دینے کیلئے پھڑک رہے تھے۔ مگر فوراً کسی ایک ناقابل بیان خیال نے جیسے اُس کے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔ محبت بھری نگاہوں سے ٹکٹکی لگا کر اُماپتی کے چہرہ کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر شرم و حیا نے اس قدر مجبور کیا کہ اُس کی آنکھیں نیچی کر دیں۔ جی بھر کر دیکھنے بھی نہ پائی۔

اُماپتی نے حسرت آمیز لہجہ میں کہا: "مکتا! اب میں جاتا ہوں۔"

مکتا نے شرماتے ہوئے آہستہ سے پوچھا: "کب آئیں گے؟"

اُماپتی نے جھجکتے ہوئے کہا: "شاید آج سے چھ ماہ کے بعد آؤنگا۔"

"آؤنگا۔ اب جاتا ہوں۔" مکتا کیشی [illegible] اُماپتی [illegible]

اُماپتی کے ساتھ ہی اگر شادی کر دی جائے۔ تو کیا کہنا ہے۔

برہمنی۔ ان سب باتوں کا خیال چھوڑ دو۔ سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے کتنا عرصہ گذر گیا۔ اِس لڑکے کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ مکت کیشی کبھی کی شادی کے قابل ہو گئی ہے۔

مکت کیشی دُوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی خود بخود اپنی شادی کر رہی تھی۔ اگر اس کی خواہش ہوتی۔ تو اپنے ماں باپ کی تمام باتیں سُن سکتی تھی۔ مگر اِس کی توجہ اِس کی طرف قطعی نہیں تھی۔ اُسے اپنے من کے لڈوؤں میں جو شیرینی حاصل ہوئی۔ اُس کے سامنے تمام باتیں ہیچ نظر آنے لگیں۔ "مکت کیشی" یہ لفظ سُنتے ہی اُس نے سمجھا کہ ماں باپ اُسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ اُس کے متعلق کس قسم کی گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ جاننے کیلئے اُس کے دل میں ایک قسم کی فکر تو گھر کر لیا۔ اپنا تذکرہ سُننے کیلئے وہ مستعد ہو گئی۔

بھٹاچاریہ کہنے لگے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے۔ اِس میں کسی قسم کی دقت نہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ میں برادری سے خارج ہو کر اپنا گھر چھوڑ کر یہاں پردیس میں پڑا ہوں۔ غریب الوطن کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہاں کوئی میری ذات برادری نہیں ہے۔ وہ جو شادی کریگا وہ سب دیکھ سُن کر کریگا۔ یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اگر کوئی یگانہ خویش ہے۔ تو وہ صرف ہری ہر کی ذات ہے۔ انہیں کے بھروسے میں یہاں رہتا ہوں۔ وہ نہایت دردرس اور ہمدرد طبیعت رکھتے ہیں۔ بالخصوص وہ اِس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں۔ دشمنوں کے دام میں پھنس کر اس حالت کو پہنچا ہوں جن وجوہات سے مکتا کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔ یہ تمام باتیں اِن پر بخوبی روشن ہیں۔ مکتا شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ یہ میں خوب جانتا ہوں۔ اگر اور کسی کی لڑکی ہوتی۔ تو اب تک بغیر شادی کے رہتی۔ تو تم ہی کتنا طوفان کھڑا کرتے۔ اور لوگ بھی طرح طرح کے فساد برپا کرتے۔ مگر ہری ہر کے خوف سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

برہمنی۔ تم جو سبب بتاتے ہو اس سے تو ہری ہر بھی اُماپتی کی شادی مکت کیشی کیساتھ کر دینے میں پس و پیش اور لیت و لعل کر سکتے ہیں۔

بھٹاچاریہ۔ نہیں نہیں۔ یہ میرا پورا بھروسہ ہے۔ میں خوب جانتا ہوں ہری ہر کا ارادہ

نہیں کر سکتے - یہ تم لوگوں کی قسمت تھی کہ پہلے یہ نہ جانا کہ بھری ہے کہ ایک کنوارا اچھا سمجھا
موجود ہے -

برہمنی - تم کیسے جان گئے کہ اس لڑکے کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی -
برہمن - میں پہلے ہی سے جانتا ہوں - شادی ہوئی ہوتی - تو مجھ سے پوشیدہ رہتی -
برہمنی - جو ہو - جس میں اسی لڑکے کے ساتھ شادی ہو جائے - کوئی ایسی تدبیر کرو -
اُس دن دونوں نے لڑکی کی شادی کے متعلق دل ہی دل میں یہی فیصلہ کیا -

نکہت کیشی نے تمام باتیں سنیں - اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ کا جلوہ دکھائی دیا -
گلابی گالوں پر گہری سرخی دوڑ گئی - اور شرم سے گردن جھک گئی - کیسی شرم - اس کی اُسے
کیا خبر - اُس نے دل ہی دل میں سوچا - اس کے ماں باپ اس کو اُسی کے حوالہ کرنا چاہتے
ہیں - انہوں نے یہی مشورہ کیا ہے - پھر سوچنے لگی - "میں تمام باتیں تو سُن ہی نہ سکی -
بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آئیں - نہیں ..... نہیں ..... میں نے سب صاف صاف
سُنا ہے - اس میں شک نہیں -" اس مرتبہ مکتا پھر ہنسی - اس کے مسرت کی ترنگوں میں
فکر و تردد کی کثافت جیسے گھُل گئی - دل کے تمام افکار رخصت ہوئے - صرف خوشی امید اور مستقبل
کی خوشنما کونپلیں پھوٹ پھوٹ لہرانے لگیں - لڑکی کی نظروں میں دنیا اس وقت [illegible] کی کان نظر
آنے لگی - فلسفہ - الم اور دنیا کے سرد گرم اثرات سے محفوظ لڑکی ہر چہار طرف سادگی اور مسرت
کا جلوہ دیکھنے لگی -

نکہت کیشی پھر دل بہلانے لگی - مگر ناکامیاب رہی - وہ اپنے جن پُرمسرت خیالات
میں محو تھی - اُن سے طبیعت ہٹانا کوئی آسان امر نہ تھا - بالآخر جھنجلا کر کھلی ہوئی لٹیں لئے
ہوئے کسی دوسرے کام میں لگ گئی ؛

ممکت کیشی کے حُسن کا راگ پچھلے ابواب میں گایا جا چکا ہے - دراصل وہ نہایت ہی حسین تھی - اُس کا حُسن کیسا تھا - یہ جاننے کیلئے سب بیقرار ہونگے - اس باب میں صرف اُس کے حُسن کا تذکرہ کیا جائیگا - حُسن کا پُورا پُورا نقشہ کھینچنا بہت مُشکل ہے - مختلف ملکوں مختلف قوموں اور مختلف لوگوں کا حُسن مختلف ہوتا ہے - خوبصورتی کے خاص خاص اوصاف ہیں - کوئی قوم برف کا سا صاف شفاف سفید بدن تانبے جیسے بال - اور بلی کیطرح آنکھوں والی عورتوں پہ فریفتہ ہوتی ہے - کوئی چھوٹے چھوٹے پاؤں - بڑی سی ناک - اور سانپ جیسی آنکھ والی عورت پر - تو کوئی چپٹی ناک موٹے موٹے ہونٹ - اور چپٹے والی عورتیں پسند کرتی ہے - کوئی سونے کی طرح رنگ شوخی اور لگاوٹ سے بھری آنکھیں - اور سیاہ بالوں والی عورتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے - اور کوئی شوخ نظر - دل چھیدنے والی طوطے کی چونچ کیطرح ناک والی عورتوں میں ہی خوبصورتی کے جوہر دیکھتی ہے - غرض اس میں سب کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہے - لوگ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی حُسن کیساتھ دُنیا میں بہت سے جھگڑتے ہیں - یہ جھگڑا تو ہے ہی - مگر زیورات کے بارے میں بھی جو مختلف الرائے ہے - وہ بھی عجیب ہے - کسی ملک کی عورتیں اپنے جوڑے میں پھول لگاتی ہیں اور وہ اُسے بہت پسند کرتی ہیں - کہیں سیندور ہی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتا ہے - کہیں چڑیا کے پر بہت خوبصورت سمجھے جاتے ہیں - طبائع مختلف واقع ہونے کی وجہ سے پسند بھی مختلف ہو گئی ہے - خواہ کچھ ہی ہو - یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جتنی قومیں ہیں - سب اور دیگر دُنیاوی کاموں میں اتفاق رکھنے پر بھی اس معاملہ میں اختلاف رائے رکھتے ہیں - مختلف قوموں میں اور ملکوں کی بات تو دیگر خود لوگوں کی بھی اس معاملہ میں ایک رائے نہیں پائی جاتی - جس وجہ سے ہم ممکت کیشی کو خوبصورت سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ اُسی وجہ سے ہمارے ناظرین اُسے بدصورت یا معمولی طور پر حسین کہیں -

اِس وجہ سے مُکت کیشی کے عضو عضو کی خوبصورتی کا تذکرہ کرنا بہت مُشکل ہے اور اگر اس بارہ میں خاموشی سے کام لیا جاوے تو ناظرین کو یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ مُکت کیشی بہت خوبصورت نہیں ہے۔ اس وجہ سے مُصنّف نے اس کے حُسن کا مُشرح ذکر نہیں کیا کیسی مُصیبت ہے؟ رقیق القلب ناظرین مُصنّف کی دِقّتوں کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ یا ہنستے ہیں اگر ہنستے ہوں۔ تو ہنسیں۔ دُنیا میں سب سے پہلے اِسی مُصنّف کو ایسی پیچیدہ دِقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسروں کے سنتوش کے لئے جب کوئی آدمی ایک کام کرتا ہے تو وہ ایسی ہی مُصیبت میں پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شاعر اُور سنسکرت کے لاثانی عالم فاضل اور غیر معمولی شُعرا بھی اِس مُصیبت سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ملک الشعرا چوڑامنی اور کالی داس وغیرہ عورتوں کے حُسن کا مرقع کھینچ کر سیر نہیں ہوئے۔ وہ نقشہ ہر شخص کو پسند آئیگا یا نہیں۔ اِسی لئے انہوں نے "روپ سنگھار" میں صاف لکھدیا ہے۔ انگلینڈ کے مشہور ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیر نے لکھا ہے۔

"Beauty is bought by the jud g-ment of the eye
Not uttered by base sale of Chapmenc tongue"

خواہ کچھ ہی ہو ہم مصنّفوں کو بغیر اس مُصیبت میں پڑے ہوئے چھٹکارا نہیں ہے۔ کسی کیساتھ اس کے حُسن کی تشبیہ دیں تاکہ مبالغہ کا رنگ پیدا نہ ہو۔ اور ناظرین ناک بھوں نہ سکوڑیں۔ ایک موجودہ شاعر نے کسی سُندری کو ناظرین کی گھر والی بیوؤں کی طرح اور پڑھنے والیوں کے نظر آنیوالے سایہ کی طرح بتلایا ہے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت اور سہل تدبیر ہے۔ مگر اِس میں نقص آپڑتا ہے۔ کہ ناظرین کو ناگوار معلوم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ناظرین کی نگاہوں میں اُن کی بیوی یا پڑھنے والیوں کی نظروں میں اُن کی جیسی سُندری دُنیا میں نہیں ہے۔ اب حال میں اِس قسم کی ایک حسین لڑکی کے حُسن کا نقشہ کھینچنے سے ممکن ہے۔ ناظرین بدظن ہو جائیں۔ اِس لئے مجھے دوسرے طریق پر اِس کے حُسن کا نقشہ کھینچیئے۔

کرشن نگر کی راج سبھا کا نام روشن کرنے والے بھارت چندر نے روپ منجری کی تصنیف میں سرسوتی کے مندر کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ یہ تو ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ کبھی بھی سرسوتی اور لکشمی نہ دکھائی دیں کیا ہے۔ کسی ناظرین میں سے کسی نے دیکھا ہے۔ لکشمی کا ناش

میں غضب کی سیاہی تھی۔ گویا صاف شفاف پانی میں نیلا کمل لہلہاتا تھا۔ دونوں آنکھیں بڑی بڑی اور سفید تھیں۔ اُن سے مکت کیشی کا پاک صاف حسن خوب جھلکتا تھا۔

مکت کیشی کی بھویں تنی ہوئی اور سیاہ تمام تھیں۔ ناک بہت خوبصورت۔ ہونٹ آپس میں ملے ہوئے جن سے ہر وقت ایک دلفریب مسکراہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ گویا وہ پکے عنّاب پھل تھے۔ جس وقت وہی مسکراہٹ اُن دونوں کو آپس میں جدا کرتی تھی۔ اُس وقت اُن کے درمیان میں کُند کے کلیوں کی طرح صاف شفاف دانتوں کا نظارہ بہت ہی دلکش نظر آتا تھا۔ اُس کی کلائی اور ہات نہایت ہی نازک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تازہ بتازہ ماکھن سے بنائے گئے ہیں۔ انسان کے جسم میں ہڈی رہتی ہے۔ مگر مکت کیشی کے ہات دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان میں کہیں ہڈی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ جب گھر کے کام کاج کرنے کے لئے مکت کیشی اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتی تھی۔ اُس وقت اُن کے ٹوٹ جانے کا گمان ہوتا تھا۔ یا جب اُسکے ہاتھوں پر کسی قسم کا بار پڑتا تھا۔ اُس وقت خوف معلوم ہوتا تھا۔ کہ کہیں اُس کے ہاتھوں میں موچ نہ آجائے۔ مکت کیشی کسیقدر لمبی تھی۔ مگر یہ لمبائی بہت زیب دیتی تھی جسم کی ساخت نہایت سڈول تھی اور عضو عضو سے حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

مکتا کی آواز نہایت ہی شیریں تھی۔ ایک مرتبہ جو سُن لیتا تھا جی چاہتا تھا۔ کان لگا کر بار بار اُسے سُنا کرے۔ جس وقت رنج و غم کی کالی گھٹائیں انسان کے آسمانِ دل پر چھا جاتی ہیں جب کبھی تختِ شاہی اور کبیر کا خزانہ دیکھ کر انسان کا دل بے چین ہو جاتا ہے جس وقت دنیا کی بیشمار تکالیف مجتمع ہو کر انسان کو خودکشی جیسا گناہ عظیم کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ اُس وقت کیا کوئی ایسا شیریں اور دل کو تسلی دینے والا سُر ہے جس کو سُن کر انسان کی تمام تکالیف مسرّت سے بدل جائیں۔ ایک گھڑی بھر کیلئے بھی دنیا سکھ کا گھر معلوم پڑنے لگے۔ دنیا چھوڑنے کو طبیعت نہ چاہے۔ اور پھر اُسی دلکش سُر کے سننے کی خواہش دل میں پیدا ہو۔ یہ کوئی ایسا سُر ہے۔ اگر انسان کے سُر میں ایسی طاقت و دلآویزی ہو سکتی ہے۔ تو مکت کیشی کے ہی سُر میں ایسی دلآویزی و طاقت ہو سکتی ہے۔

بیدردی نہ ہونے پر بھی مکت کیشی کا دل بہت اچھا تھا۔ اُس کا دل بہت وسیع تھا۔ اُسمیں محبت اور حقیقت کا نور اپنی آب و تاب دکھا رہا تھا۔ اِسی وجہ سے اُس نے بہت جلد گیان حاصل کر لیا

تھا۔ علی الصباح اُٹھنے اور شام ہونے سے پہلے چرند، پرند، چاند، سورج، درخت، بیلیں وغیرہ کی تبدیلی اور قدرت کی گلکاریاں دیکھ کر اُسے بہت مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اُس کا دل ہر وقت ایک مناسب غرور سے بھرا رہتا تھا۔ اگر کوئی ذرا بھی اُس کی طرف مشکوک نگاہوں یا ٹیڑھی چتونوں سے دیکھتا۔ تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے مکت کیشی نے زندگی بھر میں کوئی بُرا کام نہیں کیا۔

اُماپتی کے ماموں ہری ہر رائے دیکھنے میں نہایت تندرست اور گٹھیلے بدن کے تھے اُن کا رنگ سانولا تھا۔ اُن کی عمر اُس وقت پچاس برس سے کچھ ہی زیادہ رہی ہوگی۔ سر کے بال بہت خوبصورتی سے گول کٹے ہوئے تھے۔ عمر کے مطابق اُن کے بالوں میں بھی کسی قدر سفیدی آ گئی تھی بالوں کے درمیان لمبی چوٹی ہر وقت پھہرایا کرتی تھی۔ وہ نہایت سادہ مزاج شخص تھے۔ اپنی نیک مزاجی سے اُنہوں نے ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھی۔ عام طور پر لوگ اُن کی عزت کرتے تھے گاؤں میں اُن کا بڑا رعب داب تھا۔ کوئی شخص بغیر اُن سے رائے لئے ہوئے کوئی کام نہیں کرتا تھا

ہری ہر بابو کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُن کے اولاد ہوئی ہی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ اُن کے دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے کی شادی بھی کر دی تھی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بڑے لڑکے کو کسی ضروری کام کی غرض سے پردیس جانا پڑا۔ اُس وقت سے اُس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ہری ہر بابو نے اُس کی تلاش کرنے میں حتی الوسع کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مگر ہر چند پتہ لگانے پر بھی اُس کا پتہ نہیں لگا۔ ہری ہر بابو کی بڑی بہو دنیا میں ہی غم نصیبی کے دن پورے کر رہی تھی۔ بیچارے ہری ہر چھوٹے لڑکے کا منہ دیکھ کر اپنا دل بہلانے لگے۔ لیکن فلک کج رفتار سے اُن کا یہ سکھ بھی نہ دیکھا گیا۔ اُن کا یہ لڑکا بھی اُن کی گود سے جاتا رہا۔ اِس صدمہ کے بعد پھر ہری ہر بابو دنیا سے بے تعلق

اور پان لانے کیلئے آواز دی - ذرا دیر بعد شرم وحیا سے جھکی ہوئی نمت کیشی ماں کا حکم بجا لاتی ہوئی
والی حاضر ہوئی - پانی اور پان لاکر ماں کو دینے لگی - ماں نے کہا "میں کیا کرونگی"؟ "آما پتی کو دو"
شرم وحیا سے بھری ہوئی نمت کیشی نے آما پتی کو دینے کیلئے پانی اور پان ہات میں لئے -
دونوں چیزیں اُس کے ہات سے چھوٹ پڑیں - نمت کیشی بہی شرماتی ہوئی وہاں سے چلی گئی
اُس کی ماں نے کہا "اری پگلی! ایسی شرم کس کام کی" یہ کہکر وہ خود پانی اور پان لینے کیلئے چلی -
اور آما پتی نمت کیشی کیطرف پھر اُسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے -
بہن جی کے آنے پر آما پتی پان وغیرہ کھاکر بڑی دیر تک بیٹھے رہے - شام ہونے پر
تب وہ گھر جانے کے ارادہ سے اٹھے - چلتے وقت اُنہوں نے پھر نمت کی پاک صورت نہ دیکھی -

صلاح ومشورہ کرنے کے بعد آس بھتا چاریہ نے دو ہفتہ بعد ہری ہر سے شادی کے بارہ
میں بات چیت کی - آما پتی کے ماموں نے بہت خوشی سے اس معاملہ میں بات چیت کی - اُس
دن سے اُنہوں نے ایک دوسرے کو اپنا رشتہ دار سمجھنا شروع کیا - شادی ہونے میں کسی
طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں رہی جس دن یہ تجویز پیش ہوئی تھی - اُسی دن سیت آرام آدمی بھیج
کر ہری ہر نے اپنی بہن یعنی آما پتی کی ماں سے اجازت حاصل کرلی تھی - آما پتی کی ماں نہایت ہی نیک
مزاج تھیں - وہ جانتی تھیں کہ شوہر کے نہ رہنے پر بیوگی کے زمانہ میں ہمیشہ سے ہری ہر ہی اُن
کے مددگار رہے - اور فی الحقیقت ہری ہر ہی آما پتی کے سرپرست تھے - ہری ہر نے کہلا بھیجا تھا - جس
لڑکی کے ساتھ آما پتی کی شادی قرار پائی ہے - شادی ہونے کے بعد دیکھوگی - کہ وہ دیوی ہے
یا انسان؟ لڑکی سیانی ہے - یہ انہوں نے سن لیا تھا - اور اس وجہ سے وہ اور بھی خوش تھیں -
کیونکہ وہ صغیر سنی کی شادی کے مخالف تھیں - اس کے علاوہ آما پتی کی بھی عمر زیادہ ہوگئی تھی - بیوی

بھی سیانی ہے۔ تب جوڑا اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ اُما جی کی ماں کا بھی یہی خیال تھا۔ سیانی ہونے
سے وہ دنیاوی کاموں سے بہت کچھ آزادی حاصل کر سکتی تھیں۔ یہی تمام باتیں سوچ سمجھ کر انہوں
نے اس بارہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ کی۔

شادی کی بات پختہ ہو گئی۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ اُما جی کو تمام باتیں معلوم
ہو گئیں جس ہمت کیشی کو وہ مقدس تاب دیوی کی طرح دل میں سمجھتے تھے جس کی آج بات بھی
میٹھی محبت کی باتیں سننے کیلئے اُن کے کان پیاسے تھے۔ جس ہمت کیشی کے حسن کا دلکش نقشہ
آج تک صفحۂ دل پر منقش ہو چکا تھا۔ جس ہمت کیشی کے پوشیدہ نقش کے بس میں آج وہ مقید ہو
سکے تھے۔ وہی مقدس دیوی۔ وہی گرن بہارتن۔ آج اُن کی دھرم پتنی بنکر اُن کی ابھی دنیا کو
سورگ دھام بنا دیگی۔ اور اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہیگی۔

اُما جی خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ کب وہ مبارک گھڑی آئیگی جب وہ اسی مبارک وقت کا
انتظار کرنے لگے جیسے پپیہا سواتی کے بوند کی راہ دیکھا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ہمت کیشی کے
تصور میں ہر وقت محو رہنے لگے۔ گو وہ لوگ فکر ہی صحت کا سبب بتاتے ہیں۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے
فکر جو وقت بے وقت پیاری اور پیاری خواہشوں کی طرح دل بہلاؤ کا خاص سبب ہوتی ہے۔ اس وقت
اُما جی کے دل میں پوشیدہ اس فکر کی ماہیت اگر کسی کے ذہن نشین ہوتی۔ تو یہ بات صاف طور
پر معلوم ہو جاتی۔

اُما جی نے فوراً ہی لوکمد کو یہ تمام حالات لکھ بھیجے۔ اور شیاما سندری سے تمام
حالات صاف صاف کہہ دینے کی ہدایت کی۔
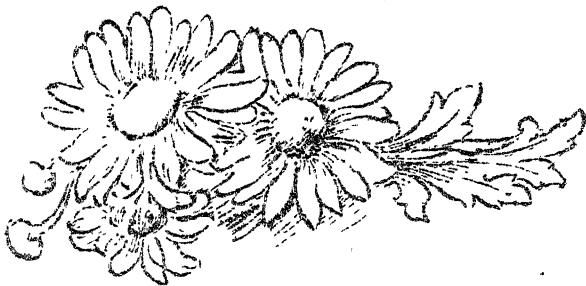
ایک دن منا جی شام کے تھوڑی دیر بعد چھتا پارہ بہاشے کے گھر سے نکل کر بہت ہی جلدی اپنے ماموں کے گھر جا رہے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ رہ رہ کر بجلی چمک چمک کر اپنا انوکھا رنگ دکھاتی ہوئی ایک دفعہ ہی جگہ جگہ پیدا کر رہی تھی۔ گھٹا ٹوپ تاریکی کی وجہ سے سامنے کا آدمی بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ راستہ میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جو لوگ گھر سے باہر تھے۔ وہ بھی آسمان کا یہ رنگ دیکھ کر اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ اس وقت کس میں ہمت تھی کہ راستہ چلتا۔ رہ رہ کر اگر بجلی نہ چمکتی ہوتی۔ تو منا جی کو کسی طرح راستہ نہ سجھائی دیتا۔ بادلوں کی گرج اس قدر خوفناک تھی کہ آواز بازگشت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کہ پہاڑ پھٹ پڑے ہوں۔ غرضیکہ جس قدر ہیبت ناک نظارے تھے۔ ان سب نے مل کر اس وقت قدرت کو اور بھی خوفناک لباس پہنا دیا تھا۔ قدرت بجلی کی طرح ہنستی تھی۔ مگر اس ہنسی سے خوف آدمیوں کی جان خشک ہوئی جاتی تھی۔

جس وقت منا جی چھتا پارہ بہاشے کے گھر سے باہر ہوئے تھے۔ اس وقت آسمان کا ایسا رنگ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں نے یہ خوفناک لباس اختیار کر لیا تھا۔ منا جی دوڑ رہے تھے۔ ایک موڑ پار کرنے سے ہی گھر پہنچ جائیں گے۔ اس جگہ پہنچنا تھا جس کے بعد ایک بڑی کوٹھی تھی۔ اس کے بعد ہی ان کے ماموں کا مکان تھا۔

منا جی بڑی تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ تاریکی میں ان کا نشانہ ہو گئی بجلی کی چمک سے ایک بار وہ بڑی دور تک راستہ دیکھ لیتے تھے۔ اور جلدی جلدی چلنے لگتے تھے۔ بس۔ فرلانگ چل کر نے کے بعد منہ میں آرام مل سکتا تھا۔ اور وہ مطمئن ہو سکتے تھے۔ مگر یکایک ایک خوفناک واقعہ کے ظہور نے ان کی رفتار بند کر دی۔ وہ دوڑ رہے تھے۔ عین اسی وقت سامنے سے کسی نے آکر کہا۔ "اور آگے نہ بڑھو۔ کھڑے رہو۔"

جب پدما نے یہ سنا کہ لوکما اور تتیا مصیبت میں گرفتار ہو کر لوپ ہو چکے ہیں۔ تو وہ بہت ہی پریشان ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ لوکما کے بغیر سیٹھ گرام میں رہنا فضول ہے اس لئے اُس نے سوچا کہ لوکما کی واپسی سے پیشتر وہ آگرہ سے ہو آئے۔ اس لئے وہ گھر کا انتظام کر کے آگرہ چلی گئی۔

اپنے ناول کے اس حصہ میں پدماوتی کو ہم لوگ اس کے مسلمانی نام لطف النسا کے نام سے پکاریں گے۔ لطف النسا پھر مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگی ہے۔ اس وقت کی لطف النسا اور اب کی پدماوتی میں بڑا فرق ہے۔ جن تمام علوم کے اثر سے لطف النسا نے ایک مرتبہ جہانگیر کے دل میں جگہ پالی تھی۔ اس وقت وہ تمام علوم بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ اس میں اب وہ پہلی سی شوخی نہیں تھی بلکہ ان سب سے متنفر ہو کر جان بوجھ کر اس نے اپنی یہ حالت بنائی تھی۔ جن لوگوں نے پہلے اسے اس طرح دیکھا تھا۔ اب وہ یقیناً چونک اٹھیں گے۔ اُف! کیسی تبدیلی آگئی۔ وہ سنگدلی کہاں چلی گئی؟ جن رسم و رواج اور چال چلن نے اس کی اصلیت میں ایک گہرا دھبہ لگا دیا تھا۔ ان سب سے متنفر ہو کر وہ اس وقت ایک دیوی بن گئی تھی۔ اب تک وہ صرف نفسانی خواہشات کے ہیبت ناک تیرہ خانے میں مقید تھی اب اس نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ دھرم کیا چیز ہے؟ اور سکھ کیسی شے ہے؟ اصلی

سکھ کا مزا اُسے اب حاصل ہوا تھا - وہ ابتک حسرت اپنے آپ کو پیار کرتی تھی - اور اب اپنے اُمید بھری نظر نگاہیں ڈالتی تھی - وہ اب تمام ہندوستان کو اپنے پیروں تلے رکھنے اور بادشاہ کو اپنا اپنا غلام بنانے کی خواہش مند تھی - اب ایک مفلس برہمن کے قدموں میں سربسجود ہوکر پھوس کی جھونپڑی میں رہنے کو تیار تھی - اِنہی وجوہات سے ہم کہتے ہیں کہ اب لُطف النسا وہ اگلی سی لُطف النسا نہیں رہی تھی - اُس نے پاک سکھ کا پتہ پا لیا تھا - اُس کے مزہ سے واقف ہوگئی تھی - اپنے مقاصد میں بہت کچھ کامیاب ہو چکی تھی - نوکمار نے اُس کے ساتھ شوہر کے سلوک کرنے کا وعدہ کیا تھا نوکمار نے اِس کے لئے آنسو بہائے تھے - اُس کے دُکھ سے دُکھی ہوئے - اِس سے زیادہ اُسے دُنیا میں کیا چاہیئے - نوکمار کی پاک محبت ہی اُس کے لئے ایک گراں بہا شئے تھی - اُسے وہ پا گئی - تمام اُمید بار آور ہوئیں - خواہشات کافور ہو گئیں - وہ کچھ نہیں چاہتی تھی - پھر وہ آگرہ جانے کے لئے کیوں تیار ہوئی ؟ وہاں اُسے کیا کام تھا ؟ جذبات نفسانی سے محظوظ ہونے کی تو اِس نے قسم کھائی تھی - پھر کیوں ؟ ... دُنیا میں محبت کون چھوڑ سکتا ہے - جو اِسے چھوڑ سکتا ہے - اُس کے دل میں کبھی محبت پیدا ہی نہیں ہوتی - بلاشبہ وہ محبت سے بے بہرہ ہے - لُطف النسا کا دل رشتۂ محبت سے بھرپور تھا - اور لطیف احساسات سے مملو - انہی احساسات نے اُسے آگرہ کی طرف کھینچا -

آگرہ پہنچ کر لُطف النسا سب سے پہلے اپنے باپ کے گھر گئی - وہاں پہنچ کر اُسے بہت تکلیف ہوئی - جس وقت لُطف النسا کی عمر اٹھارہ سال کی تھی - اِس وقت اُس کا چال چلن مشکوک ہوگیا تھا اِسی وجہ سے اُس کے باپ نے ناراض اور شرمسار ہو کر اُسے گھر سے باہر نکال دیا تھا - اِس وقت لُطف النسا بھی اِن کے نکال دینے کی وجہ سے شرمندہ نہیں ہوئی تھی - "اب سے کھٹکے لُطف اُٹھا سکوں گی" یہی سوچ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی - مگر انسان کے دل کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی - بُرے کو اچھا اور اچھے کو بُرا بنتے دیر نہیں لگتی - لُطف النسا اِس وقت بد سے نیک بنی تھی - اور اِسی وجہ سے ماں باپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی گو اُس کے باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا - تاہم بیٹی کب کہاں رہتی ہے ؟ اِس کا پتہ نشان وہ برابر لیا کرتے تھے - اِدھر ایک مدت سے لُطف النسا کہاں رہی - یہ انہیں بھی معلوم نہیں ہوا - ناظرین جانتے ہیں کہ

اتنے دنوں تک وہ سپت گرام میں تھی۔

روتے روتے لطف النسا گھر کے اندر گئی۔ دیکھا اس کے باپ رام گوبند گھوشال بیٹھے ہوئے اپنی بیوی سے نہ معلوم کیا کیا باتیں کر رہے تھے۔ بہت دنوں بعد اپنی لڑکی کو دیکھ کر دونوں بہت خوش ہوئے۔ پیار اور محبت چھپنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ محبت شکن اگر تعصب ہوا ہو۔ تو اس پر غصہ آتا ہے۔ سزا دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔ مگر اس سے کچھ محبت غائب نہیں ہو جاتی۔ بہت دنوں کا پیار کیا ایک دن میں غائب ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ستم رسیدوں اور آفت زدوں کی محبت ایک عجیب و غریب طاقت و خواص رکھتی ہے۔ اولاد کے ساتھ ماں باپ ڈانٹ ڈپٹ ضرور رکھتے ہیں۔ مگر دل ہی میں ان کے چھٹنے چھوٹنے کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گھوشال بابو اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مگر لڑکی کہیں شوخ اور دیدہ دلیر نہ ہو جائے۔ اس خوف سے انہوں نے کشادہ دلی سے اس محبت کا اظہار نہیں کیا۔ کچھ اور سننے کا موقع نہ دیکھ کر لطف النسا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے باپ کے قدموں میں گر پڑی اور خوب روئی۔ ماں باپ دونوں چونک پڑے۔ آٹھ نو برس سے لطف النسا گھر سے نکال دی گئی تھی۔ اس عرصہ میں ماں باپ سے اس نے کبھی ملاقات نہیں کی۔ آج اتنے دنوں بعد اس کے دل میں یکایک ایسی تبدیلی کیسے آئی؟ یہی وجہ والدین کے حیرت کی تھی۔ گھوشال بابو نے لطف النسا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ لطف النسا اٹھی۔ اور روتے روتے باپ سے معافی کی درخواست کرنے لگی۔

بہت دیر بعد گھوشال بابو نے پوچھا۔ "تم اتنے دنوں تک کہاں رہیں؟"

لطف النسا اٹھ بیٹھی۔ اور نیچی نگاہیں کئے ہوئے اتنے دنوں کی تمام داستان کہہ سنائی۔ یہ داستان سن کر والدین دنگ رہ گئے۔ لطف النسا کے خیالات میں ایسی زبردست تبدیلی آئی ہے سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔

گھوشال بابو نے کہا۔ "بیٹی! تم ہمارے گھر کی لڑکی ہو۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے اس قدر خوشی ہوئی ہے۔ جسے بیان نہیں کر سکتا۔ ایشور کرے۔ تم ہمیشہ زندہ رہو۔"

اس کے بعد لطف النسا ماں کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد گھوشال بابو

گھوشال نکمے شخص کی طرح خاموش ہو بیٹھے۔ پدما ان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور وہی چھوڑ کر چلنے کیلئے وداع چاہتی تھی۔ اس وجہ سے انہیں بہت دُکھ ہوا۔ بہت غور و خوض کے بعد بولے:-

لطف النسا! تو کچھ دنوں کیلئے ہمارے پاس بھی رہ۔ اس کے بعد جو ہوگا سو دیکھا جائیگا۔ یہ کہکر رام گوبند گھوشال باہر چلے آئے۔ لطف النسا اور اس کی ماں بیٹھی ہوئی طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں۔

دوسرے دن علی الصباح لطف النسا بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔ آج اس نے معمولی پوشاک زیب تن کی تھی۔ مگر وہ بہت قیمتی نہ تھی۔ جس مقصد کے لئے بیش قیمت لباس اور زیورات پہنے جاتے ہیں۔ وہ مقصد اس کی نظروں میں نہیں تھا۔

لطف النسا بادشاہ کے تخت محل میں داخل ہوئی۔ کسی نے روک ٹوک نہیں کی۔ اُسے پھر آتے ہوئے دیکھ کر دربانوں میں سے کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ آداب بجا لا کر رستہ چھوڑ دیا۔ دربار میں لطف النسا کا آنا ہوا تھا کہ [illegible] آگئے جو لوگ دنیا کے بیش قیمت جواہرات سے اپنے آپ کو مزین کرتی تھیں۔ [illegible] قیمتی پوشاک پہنتی تھیں۔ آج ان کے بدن پر ایک بھی زیور نہیں تھا۔ سب [illegible] قدر و منزلت نہیں [illegible] اور بھی سب تھا۔ پہلے جو لطف النسا شاہزادی جہانگیر کی بے انتہا محبت سے بھرپور ہو کر باتیں کر کے انہیں خوش کیا کرتی تھی۔ وہ اب نوکروں چاکروں سے اس کے دل کا حال پوچھنے جاتی ہے۔ اور ان کی تکریم و مدارات کا معاوضہ ادا کرتی ہے۔

لطف النسا نے سنا تھا کہ بردوان کے صوبیدار شیر افگن کی بیوی مہرالنسا اس وقت نورجہاں کے نام سے بادشاہ کی بیگم بنی ہوئی ہے۔ اسی وقت لطف النسا کو معلوم

ہوا کہ مہر النسا صرف نورجہاں بنی ہے۔ اور دیگر ذی عزت نام سے ممتاز نہیں ہوئی۔ اس لئے اُن
کے آرام و عافیت کے ایسے ایسے قانون نافذ ہوئے ہیں جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہیں
ہوتے تھے۔ نورجہاں حسن و جمال میں تو لاثانی تھی ہی۔ مگر **لطف النسا** نے سُنا کہ وہ صنعت
و حرفت میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کی مدد سے بادشاہ کے محل میں بھی بہت سی لاثانی تبدیلیاں
ہوئی ہیں۔ جو بدنظمی پہلے تھی وہ اب نہیں رہی۔ سب کام نہایت خوبی سے انجام پاتے ہیں۔
صرف گھر میں ہی نورجہاں کا دبدبہ ہو یہ بات نہیں تھی۔ بلکہ محل کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک اُس کے رعب کا جھنڈا لہراتا تھا۔ جہانگیر صرف برائے نام بادشاہ تھے۔ سلطنت
کے انتظامات کا بار بھی ایک طرح سے نورجہاں پر ہی آپڑا تھا۔ اُن دنوں نورجہاں کی اجازت
کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ غرضیکہ اُس کی طاقت بے حساب تھی۔

لطف النسا **مہر النسا** کو لڑکپن سے ہی جانتی تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی۔ کہ وہ حسن و
جمال میں لاثانی ہے۔ اُسی حسن نے ولیعہد سلیم کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس سے
بھی واقف تھی۔ **مہر النسا** ہر طرح سے بیگم ہونے کے قابل ہے۔ اسے بھی وہ خوب سمجھتی تھی۔ اس
وقت اُس کے اوصاف کا چرچا سُن کر وہ متحیر ہو کر سوچنے لگی جس خدا نے اُسے ایسا لاثانی
حسن دیا ہے۔ اُسی نے دل کھول کر فیاضی سے اوصاف بھی عطا کئے ہیں۔ **لطف النسا**
بہت متحیر ہوئی۔ اور نورجہاں کی بہت تعریف کرنے لگی۔

اس کے سوا لطف النسا نے یہ بھی جانا کہ نورجہاں نے شوہر کے اوپر بہت کچھ
حق جتا لیا ہے۔ جو جہانگیر روز دس بجے تک بستر سے نہیں اُٹھتے تھے۔ وہی جہانگیر
اب نورجہاں کے غیر معمولی حسن انتظام سے طلوع آفتاب سے قبل ہی اُٹھ بیٹھتے۔ جو جہانگیر
دن رات عیش و عشرت میں محو رہتے تھے۔ اب وہ اپنا ذرا سا وقت بھی فضولیات میں ضائع
نہیں کرتے تھے۔ جیسے شراب کے بغیر تسکین ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب شراب سے اس
درجہ نفور! **لطف النسا** نے دیکھا۔ یہ امید نہیں تھی۔ کہ جہانگیر کی تمام عادتیں کسی طرح
دور بھی ہو سکیں گی۔ جس عورت کی کوششوں سے جہانگیر کا چال چلن اس قدر پاکیزہ ہو گیا
ہے۔ وہ یقیناً بہشتی حور ہے۔ اور انسانی لباس میں فرشتہ ہے۔

اس کے علاوہ مہرالنسا نہایت ہی شیریں زبان اور ملنسار ہے۔ ذی حیثیت ہو کر فطرۃً انسان کسی قدر مدمغ ہو جاتا ہے۔ مگر مہرالنسا میں غرور و تکبّر کا نام و نشان نہیں۔ ہر شخص کے ساتھ اس کا سلوک قابلِ تعریف ہے۔ ہر کس و ناکس کے دُکھ درد کی طرف اُس کی نظر رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتی کہ اُس کے عہد میں کوئی مفلس بیکس اور جاہل رہے۔ اُس کے ان بہترین اوصاف کی وجہ سے تمام رعیت اور خلقِ خدا اُس کی ثنا گوئی ہیں رطب اللسان ہے۔ کہیں بھی جا کر دیکھئے۔ مرد، بچے، بوڑھے سب ہی اُسے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ تمام حالات سُن کر لطف النسا بہت ہی خوش ہوئی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا خدا نے جن تمام اوصاف سے مہرالنسا کو مالا مال کیا ہے۔ انہیں مد نظر رکھتے ہوئے اُن کا یہ نام نہایت ہی موزوں ہے۔ آہا! کیسا موزوں نام ہے۔ "نورجہاں"!۔

ایک لونڈی پاس بیٹھی ہوئی یہ سب حالات سُنا رہی تھی۔ لطف النسا نے پوچھا۔ اس وقت بادشاہ سلامت کہاں ہیں؟

لونڈی نے جواب دیا: "غروبِ آفتاب کے بعد ہی دربار ہوتا ہے۔ جہاں پناہ اس وقت وہاں ہی ہوں گے۔"

لطف النسا نے دیکھا بغیر دربار برخاست ہوئے بادشاہ سلامت سے ملاقات نہیں ہوگی۔ اُس نے پھر پوچھا: "نورجہاں کہاں ہے؟"

انگلی کے اشارے سے لونڈی نے نورجہاں کا کمرہ بتا دیا۔ لطف النسا نے کسی لونڈی کے ذریعہ اطلاع کرا دی۔ وہ کیا دیکھتی ہے کہ نورجہاں نے خود ہی آ کر اپنی بچپن کی سکھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
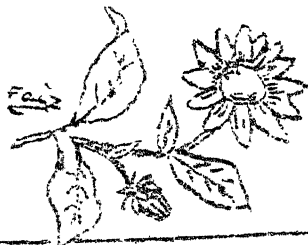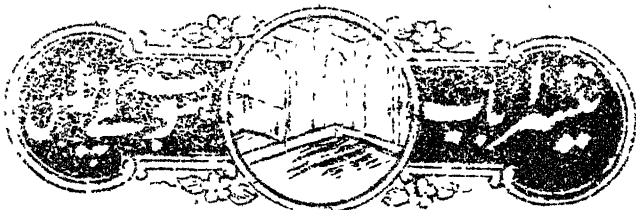
لطف النسا کے بیٹھ جانے پر مہرالنسا بھی بیٹھی۔ کسی وقت یہ اسی طرح لطف النسا بھی جہانگیر کی بیگم بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اور اس دل پر ویسے طور سے شیخ پڑ چکی تھی۔ ایک مرتبہ لطف النسا نے ارادہ کیا تھا کہ ترقی کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرے گی۔ اس وقت لطف النسا نے سلطنت کے ہر ایک شعبہ میں خاطر خواہ اور بے مثل ترقی کیلئے سوچا تھا۔ اس نے ولیعہد سلیم کے عوض ان کے بھتیجے کے لڑکے خسرو کو سلطنت مغلیہ کے تخت پر بٹھانا چاہا تھا۔ ایک مدت سے یہ بات سوچا تھا۔ کہ شاید ان لوگوں کو لطف النسا کے ماتحت رہ کر دن گذارنے ہونگے۔ اور لطف النسا اس تخت کو نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اس تخت کا لطف لینا تو درکنار۔ اس کو خیال میں بھی لاتے ہوئے طبیعت مکدر ہوتی تھی۔ مہرالنسا کو شاہی تخت پر بیٹھی ہوئی دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور خود ملکہ کو مخاطب کر بیٹھی۔

آج مہرالنسا اور لطف النسا میں بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اتنے دنوں کے اندر کتنی ہی تبدیلیاں ہوئیں۔ شیر افگن کی بیوی مہرالنسا شہنشاہ جہانگیر کی خاص بیگم ہوئی۔ اور جس کیلئے وہ جگہ تجویز کی گئی تھی۔ اس کی کیا حالت ہوئی وہ سب چھوڑ چھاڑ کر زندگی سے ہی ہاتھ دھونے کا سامان کر رہی ہے۔

لطف النسا کے چہرہ پر مسرت جھلک رہی تھی۔ دنیاوی نقطۂ نگاہ سے ان مستقل اصولوں پر نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ مگر نگاہ تاثر سے دیکھنے میں یہ خیالات کافور ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اُف! لطف النسا کی بھی کیا زندگی تھی۔ تمام امیدوں اور ولولوں پر اس نے خود ہی پانی پھیر دیا۔ وہ ایک ایسی بیل بن گئی جس کی جڑ خشک ہو رہی تھی

آگ میں رکھنے سے دھات پگھل جاتی ہے۔ اس کا جوہر بےکام ہو کر تیزاب اور خاک ہو جاتا ہے۔ مگر وہ اس اُسی کا نام کیمیا ہے۔ اُس کی قیمت اصلی دھات سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح لطف النسا کے دل میں حقیقت پسندی اور شوہر پرستی کی آگ نے داخل ہو کر اس کے اگلے پچھلے تمام خیالات کو گھاس پھوس کی طرح جلا کر خاک کر دیا تھا۔ فضول اور بیہودہ خیالات کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ اچھے اور پاک خیالات نے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر اس کی پیشتر جیسی حالت ہوتی۔ تو اپنی جگہ پر مہر النسا کو مسند نشین دیکھ کر رقابت اور حسد کی آگ دل میں مشتعل ہو جاتی۔ لیکن اب اس کی نظر ان فضولیات اور توہمات پر نہیں تھی۔ اُسے کوئی علی مرتبہ حاصل کرنے کی خواہش ہوئی تھی۔ جسے پانے کی تمنا اُس کے دل میں تھی۔ وہ پا گئی۔ اس وقت وہ مہر النسا کے تخت سے کھیلتی تھی۔ سیر پر ہوتا کی کرنا۔ جب اُس نے ان خیالوں سے آزادی حاصل کی وہ اس وقت اُس کے گُن گا رہی تھی۔ پہلے مہر النسا کو وہ رقابت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اِس وقت اُس کی نگاہیں پاک تھیں۔ وہ اس وقت نورجہاں کو اپنی محسن سمجھتی تھی۔ مہر النسا کو وہ اپنے راستہ میں مددگار سمجھتی تھی۔ اگر مہر النسا کا حسن و جمال ولیعہد کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہ کرتا۔ اور اُسے دیکھ کر اگر ولیعہد مہر النسا پر عاشق نہ ہوتا۔ تو اس وقت اس کی امید کا راستہ خس و خاشاک سے پاک ہو جاتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ وہ موہ جال میں پھنستی جاتی۔ اور شاید دامِ صیاد میں پھنسے ہوئے پرند کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی۔ لطف النسا کے یہ تمام باتیں بخوبی ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ اُس میں حسد و کینہ کا نام بھی نہیں تھا۔ بلکہ تعدّی سے معمور ہو رہا تھا۔ اُس کے خوش ہونے کا اور بھی ایک سبب ہے۔ نورجہاں کے حُسن و جمال اور اوصاف کا تذکرہ سن کر وہ فریفتہ ہو گئی تھی۔ اور ہر طرح سے اس تعلق کو مناسب سمجھتی تھی۔ اُس نے سوچا۔ کہ کاش! یہ فخر مجھے حاصل ہوتا۔ تو کیا اچھا ہوتا جو نہیں نورجہاں کی سلیقہ شعاری سے کتنے ہی اچھے اچھے کام انجام پا رہے ہیں۔ میں کبھی نہیں کر سکتی۔ بہت اچھا ہوا کہ مہر النسا بادشاہ کی منظورِ نظر ہوئی۔

دیر تک دونوں میں بات چیت ہوتی رہی۔ لطف النسا نے اشارہ اشارہ میں بہت سی باتیں مہر النسا سے پوچھ لیں۔ اتنے میں خبر آئی کہ بادشاہ سلامت دربار برخاست کر کے

محل میں تشریف لائے ہیں۔ اپنی پیاری سکھی سے رخصت ہو کر لطف النسا بادشاہ سے ملاقات کرنے چلی ❖

جہانگیر کے پاس پہنچ کر لطف النسا نے تعظیم و تکریم سے اپنا سر جھکا دیا۔ بہت دنوں بعد لطف النسا کو دیکھ کر جہانگیر بہت خوش ہوئے خوشی کیساتھ خیریت دریافت کرنے لگے۔ لطف النسا نے اس کے جواب میں عرض کیا: "حضور والا کی شان کی بدولت ہر طرح سے سب اچھا ہی اچھا ہے۔ آپ کی رائے کے بموجب اس بدبخت نے پھر شادی کی ہے۔ اس لئے وہ اب دوسرے گھر کی بہو ہے۔"

متحیر ہو کر بادشاہ بولے: "لطف النسا اس مذاق کا مطلب میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

لطف النسا: "مذاق نہیں سچی بات ہے۔ بدنصیب لطف النسا اس وقت حضور کیساتھ مذاق کرنے کے قابل نہیں۔"

بادشاہ: "کس کیساتھ تمہاری شادی ہوئی؟"

لطف النسا: "نئی شادی نہیں ہے جو شادی پہلے ہوئی تھی۔ اس بدبخت کی بدنصیبی کی وجہ سے وہ اتنے دنوں تک پوشیدہ اور خفیہ رہی۔ اب بڑی کوششوں سے میرے پہلے شوہر نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی ہے۔"

چپکے بادشاہ دیر تک سنتے رہے۔ اس کے بعد متانت آمیز لہجہ میں بولے: "لطف النسا تو کیا۔ اتنے دنوں بعد تم مجھے بھول جاؤ گی؟"

لطف النسا کچھ نہ کہہ سکی خاموشی نے لبوں پر مہر لگا دی۔

بادشاہ: "تمہارے شوہر کی اولاد بھی کوئی ہوئی ہے؟"

لطف النسا: "تھیں۔ مگر اب وہ مر گئیں۔"

رُوح ناپاک ہو گئی ہے۔ اب خواہ کتنا ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ملے۔ میں اُسے نہیں قبول کروں گی۔ اِس
سکھ کی لالچ نہیں چھوڑ سکوں گی۔ آپ اگر اتنا کوئی سامان کریں گے۔ تو میں کسی طرح اُسے نہیں روک
سکوں گی۔ اِس لئے جہاں پناہ میری زندگی کا تمام سکھ دُکھ آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ مجھ پر بہت پیار
کرتے آئے ہیں۔ یہ میں بخوبی جانتی تھی۔ اُسی پیار کو یاد کر کے کہتی ہوں۔ اِس وقت دوستی کا فرض
ادا کیجئے۔ ایسی مُرادی جانی پہچانی اِس بدقسمت عورت کو بچائیے۔ اِسے اُس کے سکھ کے راستہ میں چلنے
دیجئے۔"

بادشاہ خاموش رہ گئے۔ کچھ نہیں سمجھے کہ کیا جواب دوں۔ اُن کے چہرہ پر فکر کے آثار نظر
آئے۔ بادشاہ کو چپ دیکھ کر لطف النسا نے پھر کہا۔ حضور! اِس لونڈی کی باتوں سے آپ کو تکلیف
ہوتی ہے۔ یہ میں سمجھتی ہوں۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ آپ کا دل تکلیف دینے کی چیز نہیں
پھر لطف النسا اتنی بات کیوں کہہ رہی ہے۔ وہ بادشاہ سے کچھ بھیک چاہتی ہے۔ ایک سال
پیشتر لطف النسا بادشاہ سے محبت کی بھیک مانگتی تھی۔ لیکن اب اسے اس کی خواہش نہیں
اِس وقت وہ صرف اس قدر چاہتی ہے کہ پہلے کی تمام باتیں بھول کر جہاں پناہ اُسے رخصت کر دیں۔
جہانگیر نے کہا۔ لطف النسا! جب سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں پھر کہتا ہوں تم
مجھے چھوڑ کر چلی جاؤگی۔ یہ بھی برداشت کروں گا۔ کیونکہ مجھے چھوڑنے پر تم آسودہ حال ہو جاؤگی لیکن مجھے
چھوڑنے پر تمہیں جو تکلیف ہوگی۔ وہ کیونکر برداشت کر سکوں گا۔ لطف النسا! ذرا غور تو کرو۔ دودھ
کی طرح صاف شفاف اور مخمل کی طرح ملائم بستر پر بھی تمہیں نیند نہیں آتی تھی۔ تمہارے تلووں میں ذرا
سی خراش آ جانے پر میں نے کئی بار اُسے رومال سے صاف کیا ہے۔ تو بھی تمہاری طبیعت نہیں
بھرتی تھی۔ دور دور سے اچھے اچھے بیش قیمت لباس اور زیورات منگوا کر تمہیں دیتا تھا۔ تو بھی تم
خوش نہیں ہوتی تھیں۔ مُلکوں مُلکوں سے عمدہ عمدہ کھانے کی چیزیں منگاتا تھا۔ پھر بھی تمہاری زبان
لذت نہیں پاتی تھی۔ گرمی کے دنوں میں برف کی طرح سرد کمرے میں رہ کر بھی تم مطمئن نہیں ہوتی
تھیں۔ ان سب کے علاوہ دہلی کا بادشاہ جہانگیر تمہارا حکمی بندہ تھا۔ اُسے بھی تم اپنی غلامی کے قابل
نہیں سمجھتی تھیں۔ لطف النسا! اب تم موٹے چاول کھاؤگی۔ موٹے کپڑے پہنوگی۔ اور بُری سے
بُری جگہ رہوگی۔ یہ تکالیف تم کیونکر برداشت کر سکوگی۔ سوچتے ہی کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے۔ اور کوئی

اپنی ذرا سی خودغرضی کی وجہ سے مجھے کسی طرح تمہارا نقصان منظور نہیں۔ بلاشبہ گذشتہ ایام کی
کی یاد سے تمہارے دل کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ اس لئے ان باتوں کا ذکر چھوڑو۔ میں بھی مطمئن
رہونگا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم پر اپنے افضال و اکرام نازل کرے۔ گو اس طرح تم سے
قطع تعلق کرنے میں مجھے تکلیف تو بہت ہوگی۔ مگر میں یہ بھی برداشت کرونگا۔ تم جیسے بھی
خوش ہوگی میں بھی اسی میں خوش رہونگا۔"

جہانگیر کی باتوں سے لطف النسا بہت خوش ہوئی۔ بولی۔ بادشاہ سلامت! آپ
کی مشفقانہ تقریر سے میرے دل میں مسرت کا دریائے بیکراں موجیں مار رہا ہے۔ جہاں پناہ!
یہ لونڈی آپ سے علیحدہ ہو کر تکلیف محسوس کریگی۔ یہ نہ سمجھئیگا۔ آپکے سکون و اطمینان کا
تصور ہی میرے دل میں ایک لطف آمیز بیخودی پیدا کر رہا ہے۔"

جہانگیر نے کہا: "لطف النسا! ایک وقت تھا۔ میں تمہارا اسقدر مشتاق تھا۔ ابھی ویسا
ہی ہوں جس دن پہلے پہل تمہیں دیکھا تھا۔ اس وقت سے آج تک اسیر دام رہا۔ اور اب
بھی ہوں۔ مگر آج ان تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ تم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس راستہ
سے تمہیں ہٹانا بہت مشکل ہے۔ اور میری یہ خواہش بھی نہیں۔ میں تمہارے سکھ کے
راستہ میں کانٹے بونا نہیں چاہتا۔ مجھے تمہیں رخصت کرنا پڑیگا۔ لیکن اس سے میرے
دل کو ناقابل برداشت صدمہ ہوگا۔ میں جانتا ہوں میرا کلیجہ پتھر کا نہیں کہ تمہیں
ہمیشہ کے لئے رخصت کرتے ہوئے یہ آنکھیں آنسوؤں کا سیلاب بہانے میں احتیاط
سے کام لیں۔ میں تمہیں بھول جاؤں۔ یہ میرے لئے ناممکن ہے۔ لطف النسا! جب
تک جان میں جان ہے۔ تمہاری تصویر میرے صفحۂ دل پر ہمیشہ نقش رہیگی۔"

لطف النسا نے کہا: "جہاں پناہ! وہ پھول کس کام کا جس کی بوئے خوش سے دل و دماغ
معطر و معنبر نہ ہو جائیں۔ یہ لونڈی بھی کیا آپ کو بھول جائیگی۔ اس نے بہت دنوں تک آپ
کے آغوش محبت میں پیار و محبت کی بہاریں لوٹی ہیں۔ اور آپ کے روبرو ہر وقت قصوروار
ہے۔ آج ان قصوروں کے لئے دست بستہ معافی کی خواستگار ہے۔"

جہانگیر نے بات کاٹ کر کہا: "میں تمہیں معاف کرونگا۔ یا تم مجھے کرو گی۔ جو ہو —

نہیں ملی۔ اس کے لئے اسے معاف فرمائیگا۔ حضور! کیا اپنا دل کسی [illegible] سے کسی طرح
دکھایا جا سکتا ہے۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہوتا تو اس لونڈی کے دل کی جو حالت ہے۔ وہ
آپ کو دکھائی جاتی۔ اس وقت آپ دیکھ سکتے کہ اس نصیبوں جلی کے کلیجہ میں کیسی شعلہ
زن آگ مشتعل ہے۔ بجز موت کے اور کسی طرح اس کم بخت کو ان مصائب سے چھٹکارا نہیں
مگر لطف النسا کیلئے موت کہاں؟ معلوم ہوتا ہے۔ خدا نے گناہوں کی مجسم شکل دکھانے
کیلئے اسے یہ دم لاثانی بنا رکھا ہے۔ اس وقت میری نگاہوں میں موت کی بڑی وقعت ہے۔
کاش! وہ آجائے۔ تو میں اس کا نہایت اعزاز و احترام سے خیر مقدم کروں۔ ذرا بھی خوف
نہ کھاؤں۔ جہاں پناہ! اس کمبخت زندگی کا سا ٹھ عرصے تک رہنے کی ذرا بھی خواہش نہیں
ہے۔ جتنی جلدی دنیا کے پردے سے لطف النسا کا نام نابود ہو جائے اتنا ہی اچھا ہو۔
گناہوں کی آگ میں لطف النسا کی زندگی روز بروز بھڑکتی ہوئی جل رہی ہے۔ اس جلتے
ہوئے دل کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لطف النسا نے ایک گناہ چھوڑ کر دوسرے گناہ کے بیچ
غار میں قدم رکھا ہے۔ ٹھنڈک کہاں ہے جو اس سے آگ کا زور کم کیا ہوتا۔ بلکہ اور بھی بڑھ
گیا۔ اس بدنصیب نے زندگی کے تمام گذشتہ واقعات کی نسبت سے غور کر دیکھا ہے۔ تمام
گذری ہوئی باتیں اور واقعات بے بس پچھلے اور آب سراب کی طرح نظر آتے ہیں۔

ایک دن، صرف ایک ہی دن، لطف النسا نے زندگی بھر میں سچی خوشی حاصل کی تھی۔
۔۔۔۔ اول سے آخر تک سب باتوں کو یاد کر کے دیکھتی ہوں۔ اور ایسی دن ویسی خوشی کا احساس
نہیں ہوا جب دن اس بدنصیب نے اپنے شوہر کے پاک قدم اپنے سینہ سے لگائے تھے۔
جہاں پناہ! اس بدبخت کی زندگی کا یہی دن اس کے شباب کا دن تھا۔

بادشاہ سلامت! جہاں آپ کو کہتے ہیں مجھے بھول جائیے۔ لطف النسا کا کبھی نام
اپنی زبان پر نہ لائیے۔ لطف النسا نہایت گنہگار، بدبخت اور دنیا سے گئی گذری ہے۔
مغلیہ سلطنت کے تخت نشیں شہنشاہ جہانگیر کے دل میں جگہ پانے کے قابل نہیں
ہے۔ جو کچھ آپ نے اس کی بہتری کی ہے۔ وہ سب آپ کی بزرگی کی علامت ہے۔ آپ کے
حضور میں یہ لونڈی بہت سے قصوروں کی معافی چاہتی ہے۔ اس کے نام [illegible]

اپنے دل سے دُور کر دیجئے۔ بھُول کر بھی یہ نہ سوچئیے کہ آپ کیساتھ میری کبھی کی شناسائی تھی۔ لُطف النسا نامی کوئی عورت ہے۔ یہ بھی نہ خیال کیجئیگا۔ اُس کے رنج وغم میں سر وقت مبتلا رہنا ہے۔ اور کسی کے تصور میں محو ہو کر میری پیاری بہن مہرالنسا کو نہ بھُول جائیگا۔ وہ جہاں دُنیا کا روشن ستارہ ہے۔ وہ فرقۂ اناث میں ایک گراں بہا لعل ہے۔ آپ جیسے قابل ترین شخص کیلئے ایسی ہی بیگم کی ضرورت تھی۔ اُس کے حُسن میں ایک عجیب و غریب دلآویزی ہے۔ وہ لاثانی ہے۔ اوصاف کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اپ لونڈی نورجہاں کا طرز معاشرت دیکھ کر دنگ رہ گئی ہے۔ آپ تو ایک بار میری یاد دلا کر اُن سے میرے لئے آخری رُخصت مانگئیگی۔

جہاں پناہ! میں اس وقت اپنے شوہر کے پاس جاتی ہوں۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی ہوگی یا نہیں اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً اب ملنا ملانا غیر ممکن ہے۔ آج کی ملاقات کو ہی آخری ملاقات سمجھئیگا۔

زیادہ لکھ کر حضور کا قیمتی وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو یہ خط کبھی رنجیدہ نہ کریگا۔ مگر دیکھتی ہوں کہ لُطف النسا کا دل پتھر سے بھی سخت اور بے مروت ہے۔ اُس رس سے خالی دل میں دھرم کے رس کی چند بوندیں خوش نصیبی سے ٹپک پڑیں۔ سخت دل میں کسی قدر لچک آ گئی ہے۔ حضور! ذرا سوچئیے تو سہی! اُسے اس وقت خبردار کرنے سے پھر پہلے جیسی حالت ہونے میں کتنی دیر لگیگی۔ ہم نہیں دعوات سے الگ کے بعد پھر حضور تو میری حالت سے بھی آگاہ ہی نہیں ہو سکیں گی۔ صرف ایک بار آرزو حضور کو دیکھنے کی دل میں آرزو ہے۔ وہ ملاقات کب ہوگی؟ جس وقت لُطف النسا کفن پہنے لیٹی رہیگی۔ اور دُنیا کے شور و شغب کی آواز اُس کے کان نہیں سُن سکینگے۔ اُس وقت اگر آپ اُس سے ملیں تو اُس کی یہ آخری آرزو بھی پوری ہو جائیگی۔ ورنہ کچھ نہیں چاہتی۔ صرف اسی قدر عرض ہے کہ لُطف النسا کی موت کے کچھ دن پہلے ہی آپ کے پاس یہ خبر پہنچ جائیگی۔

جہاں پناہ! پھر کہتی ہوں۔ مجھے بھُول جائیے۔ میرے ساتھ جو ملاقات مدارات تھی۔ جو تعلق تھا۔ وہ سب میرے نام کیساتھ ہی بھُول جائیے۔ میں صرف اسی قدر چاہتی ہوں کہ اس گنہگار کا نام آپ کی زبان مبارک پر پھر کبھی نہ آئے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ پیاری

بہت خوش جہاں کیسا تھا ہمیش خضوبہ کی لکنت اٹھاتے ہوئے عرصہ دراز تک حکومت کرتی رہی۔

خط پڑھ کر لطف النسا نے پھر لفافہ میں بند کیا اور اس پر پتہ لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔
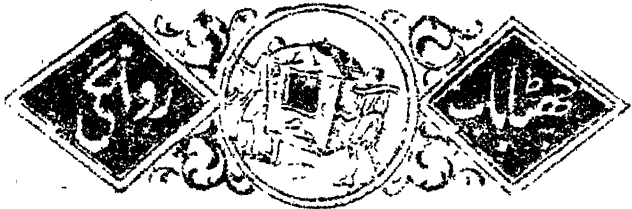
لطف النسا کو سیت گرام پہونچے ہوئے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ ہفتے میں حسب وعدہ

تب کر لطف النسا نے ماں باپ سے سیت گرام جانے کی اجازت چاہی۔ علی الصباح روانگی کے لئے سب کچھ ٹھیک پایا۔ اور آدمی وغیرہ شام ہی سے ٹھیک کرتے گئے۔

دوسرے دن لطف النسا ماں باپ سے رخصت ہو کر پالکی پر سوار ہوئی۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی۔ لطف النسا نے آگرہ کی تخت چھوڑ دی۔ جس آگرہ میں اس کا اس قدر اعزاز و احترام تھا جس کی ایک ایک چیز کو وہ پیار کرتی تھی جس آگرہ میں لطف النسا کو دیکھ کر خوش ہی چہچہاتے تھے۔ اور جہاں امیر امرا کے لڑکے لطف النسا کی ایک نگاہ ناز دیکھ کر از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ اسی آگرہ کو آج لطف النسا نے خیر باد کہا۔

وقت ! عجیب ہے۔ اس کی طاقتیں بے حد و حساب ہیں۔ بے جاندار کو بیجان اور بیجان کو جاندار بنا سکتا ہے۔ اس میں اس قدر طاقت ہے کہ پھول کو پتھر اور پتھر کو پھول بنا سکتا ہے۔ خشک درخت کو بار آور کر سکتا ہے۔ اس کا ہر کام نرالا ہے۔ اس نے جس پتھر کے ٹکڑے پر کسی قسم کی صورت پیدا کی کو انسانی دیوی بنا دیا ہے۔ وہ منتر عجیب و غریب ہے۔ اس کے غیر معمولی منتر کی طاقت سے پدماوتی کی خشک اور مرجھائی ہوئی بیل آج پھر سرسبز و شاداب اور بار آور نظر آتی ہے۔

کئی دنوں بعد ایک دن دوپہر کے وقت لطف النسا ایک سرائے میں اتری۔ نوکروں

چاکروں نے ایک کمرہ رہنے کے لئے ٹھیک کیا۔ اور تمام ضروری اشیا بھی مہیا کر دیں۔

کھا پی کر لطف النسا تنہا اس کمرے میں آرام کرنے لگی۔ اس کے نوکر چاکر دوسرے کمرے میں تھے۔ خادموں کی خدمت سے لطف النسا لیٹتے ہی سو گئی۔ بہت دیر بعد کچھ شور و غل سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سنا کوئی شخص کرخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ تو نے یہ کہاں پائی؟ یہ بڑی قیمتی شے ہے۔ یقیناً تو نے اسے چرایا ہے۔

دوسرا التجا آمیز آواز سے کہہ رہا تھا۔ میں غلط کہتا ہوں تو تمہارے قدم چھو کر قسم کھاتا ہوں۔ میں نے چوری نہیں کی جس کی یہ چیز ہے۔ اسی نے مجھ کو دی ہے۔ دوسرا شخص جو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا بولا "کیا کہتا ہے؟ اتنی قیمتی چیز یونہی تجھے بھیک دے دی!!"

رنگین مزاج لطف النسا کو اصل واقعات معلوم کرنے کی بڑی خواہش ہوئی جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ اسی طرف کی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ سرائے والا ہاتھ میں ایک انگوٹھی لئے ہوئے سامنے کھڑے ہوئے شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ ہر طرف لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اصل واقعہ سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے لطف النسا نے اپنی ایک باندی کو بھیج کر ان دونوں کو اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔ فوراً ہی سرائے والا اس شخص کو ساتھ لیکر وہاں حاضر ہوا۔

لطف النسا نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ یہ شخص انگوٹھی فروخت کرنے کے لئے لایا ہے۔ مگر چونکہ یہ بیش قیمت ہے۔ ایک معمولی شخص کے ہاتھ میں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کوئی راز پنہاں ہے۔

لطف النسا نے کہا "انگوٹھی تو دیکھوں"

سرائے والے نے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں دیدی۔ انگوٹھی دیکھتے ہی لطف النسا چونک اٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ تمام خوشی کافور ہو گئی۔ گزشتہ باتوں کی یاد نے اس کے دل کو بیقرار کر دیا۔ اس نے انگوٹھی فروخت کرنے والے سے پوچھا۔ تو نے یہ انگوٹھی کہاں پائی؟

اس نے کہا۔ بی بی صاحبہ! میں مفلس برہمن ہوں۔ کاشی جی میں رہتا ہوں۔ بھیک مانگ کر زندگی کے دن بسر کرتا ہوں۔ ایسے مفلس اور بدحال شخص کے پاس اس قدر بیش قیمت

شے کا ہونا باعث استعجاب ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ مائی جی! میں مفلس ضرور ہوں۔ مگر چیڈ نہیں ہوں۔ میں نے یہ گراں بہا چیز بھیک میں ہی پائی ہے۔

لطف النسا نے کہا۔ یہ تمہیں کس نے دی؟

فقیر نے جواب دیا کئی مہینے ہوئے یورپ سے ایک سیٹھ جی اپنے کنبہ سمیت کاشی جی آئے تھے۔ میں نے اُن کے روبرو دست سوال دراز کیا۔ ان لوگوں نے بڑی مہربانی کی۔ اُن کنبہ میں ہی ایک نوعمر عورت تھی۔ میں نے جب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ تو اُس نے کہا "میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تجھے کیا دوں" مجھ اُس بے مثل حُسن دیکھکر مجھے یقین نہ آیا۔ دِل میں سوچنے لگا جو دولت حُسن سے مالامال ہے۔ اُس کے پاس زر و مال کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ اس خیال سے پھر بیچھے ہٹا۔ اُس نے تھوڑی دیر کی غور و خوض کے بعد اپنے بالوں کے جوڑے سے یہی انگوٹھی نکال کر کہا "میرے پاس اور کچھ نہیں ہے صرف یہی انگوٹھی ہے۔ اس کی مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ تو اسے لیجا۔ اس وقت وہ اکیلی تھی۔ عزیز و اقارب دُور بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اتنا زیادہ دیتے دیکھا۔ کہ یہ قیمتی چیز ہے۔ سوچنے لگا۔ کہ حتے المقدور اسے نہیں فروخت کرونگا۔ لڑکی کی شادی کے موقع پہ دونگا۔ مگر اس وقت بہت افلاس اور مجبوری کی حالت میں بغیر فروخت کئے ہوئے کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ مگر دیکھتا ہوں۔ کہ مفلس کی قسمت ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی ہے۔ یہاں بیچنے کیلئے انگوٹھی دکھائی۔ تو اُلٹے چور سمجھ کر پکڑا جا رہا ہوں۔ اب لوگوں کے جو ایمان میں آئے کیجئے۔ یہ کہکر وہ فقیر خاموش ہو گیا۔

لطف النسا نے کہا۔ "تم بتا سکتے ہو۔ کہ وہ سیٹھ جی کہاں کے رہنے والے تھے؟"

مفلس فقیر نے جواب دیا "جی نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم!"

لطف النسا نے پھر سوال کیا جس نے تمہیں یہ انگوٹھی دی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کے رشتہ دار تھے

"بی بی! معاف فرمائیے۔ یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟"

لطف النسا۔ "خیر یہ تو بتاؤ۔ وہ دیکھنے میں کیسی تھی؟"

فقیر۔ "بی بی صاحبہ! حقیقت تو یہ ہے۔ ایسا دلآویز حسن آجتک میری نگاہ سے نہیں گذرا"

بہت دنوں سے لوگ راد ھیکا کے حالات سے واقفیت نہیں ہوئی -
اس لئے اب ان کے حالات پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے - شام ہو چکی تھی
مغرب میں آسمان پر طرح طرح کی گلکاریاں ہو رہی تھیں شفق کی سُرخی دیکھ کر گمان ہوتا
تھا گویا کوئی سیندور کا پہاڑ کھڑا ہے - آفتاب کی کمزور کرنیں درختوں کے پتّوں
اور گل بوٹوں پر پڑ کر سب کو زعفران پوش بنا رہی تھیں - گائیں اپنے تھان کو واپس آ
رہی تھیں اور چرواہے کندھے پر لاٹھی رکھے ہوئے ان کی نگرانی میں مصروف نظر آ رہے
تھے -

جب جسطرف کوئی صاحب دقار شخص جھکتا ہے تو عوام کا رجحان بھی اسی طرف ہو جاتا ہے
انسانی سوسائٹی کا یہی قانون ہے قدرت بھی اسی قانون پر چلتی ہے - زمانہ قدیم میں والیان ریاست
کے محل میں ایک سے زیادہ رانیاں ہوتی تھیں - مگر خاص خاص منظور نظر رانی کے شکم کی عزت ہوتی
تھی - وہ دریائے مسرت میں ڈوبتی تیرتی تھی - باقی جو دوسری رانیاں ہوتی تھیں -
ان کے آفات و مصائب بے انتہا ہوتے تھے ہمیشہ ملول و متفکر نظر آتی تھیں - صبح جس وقت
آفتاب مشرق سے آب و تاب کیساتھ طلوع ہوتا ہے - اسکی طلائی رنگ آمیزیوں سے

ہر شے میں ایک دلفریبی آجاتی ہے۔ اس کی زیب و زینت اور دلآویزیوں کا نقشہ کون کھینچے؟
اس وقت جب اسے چھوڑ کر دو منزلہ کیساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ اسی وجہ سے
بستی کے دل میں کچھ ملال آگیا ہے۔ اس کے چہرے پر سیاہی جھلک رہی ہے۔ اسے چھوڑ کر
سورج دیوتا جس پر رتنجھے ہیں۔ اس کی ہنسی روکے نہیں رکتی۔ وہ منظر سے ہر جگہ طرف پھیل
رہی ہے یہی وقت ہے جبکہ تو دیپ کے ایک دو منزلہ مکان کی چھت پر ایک نوجوان
اور ایک عورت دونوں بیٹھے ہوئے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ بھاگیرتی کے
صاف شفاف اور مقدس دھارے سے ٹکرا کر طراوت لیتی ہوئی نسیم موج شمیم آہستہ
آہستہ اٹھلاتی ہوئی آکر دونوں کی پیشانی کا بوسہ لے رہی تھی۔ ان کے کپڑوں کو ایک جنبش
دکھاتی تھی اور عورت کے بکھرے بالوں کو نچاتی تھی۔ عورت کی سانسیں پھولوں کی خوشبو
کیساتھ ایک عجیب طراوت پیدا کر رہی تھیں۔

عورت کو شاید سب نے پہچان لیا ہوگا۔ وہ تو کمار کی بہن شیاما سندری تھی اور
اس کے پہلو میں اس کے شوہر متھرا ناتھ تھے۔

شیاما نے کہا۔ "اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے؟"

متھرا ناتھ۔ "ابھی رکاوٹ باقی رہی۔ تو شاید میں اس مرتبہ بچتا۔ تمہارے
اس چاند سے چہرے کو دیکھ کر بھی کیا حوش رہ جاتا ہے؟"

شیاما۔ "نہیں رہتا۔"

متھرا۔ "نہیں۔"

شیاما۔ "پھر تو کوئی فکر نہیں اب جب کوئی بیمار ہو۔ تو اسے میرے پاس
لے آنا۔ میں ان لوگوں کو اپنا منہ دکھاؤں گی۔ اور وہ بھلے چنگے ہو جائیں گے۔"

متھرا۔ "سب کچھ کر اچھے نہیں ہونگے۔ اس میں بھی خصوصیت ہے۔"

شیاما۔ "کیسی خصوصیت؟"

متھرا۔ "جس نظر سے میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ ویسی نظریں ہونی چاہئیں۔"

شیاما۔ "تم جس نظر سے مجھے دیکھتے ہو۔ وہ تو میں جانتی ہی ہوں۔ اگر اس نظر
سے دیکھنے میں تمہارا مرض چلا جاتا ہے تو اوروں کا بھی چلا جائے گا۔"

متھرا: "تو کیا میں تمہیں اسی نظر سے دیکھتا ہوں جس سے اور سب دیکھتے ہیں؟"

شیاما: "ہاں عموماً یہی ہے۔"

متھرا: "نہیں شیاما! تمہارا یہ خیال ہے۔ ایسی بات نہ کہو۔ اتنے دنوں تک میں نے تمہارے ساتھ جیسا سلوک کیا ہے۔ اس سے تم ایسا کہہ سکتی ہو۔ مگر کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے اپنی خواہش سے ایسا سلوک نہیں کیا۔ شیاما! تم میرا کلیجہ چاک کر کے دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ میں تمہیں کس قدر پیار کرتا ہوں۔"

شیاما: "کیا میں تمہاری ان باتوں میں آجاؤں گی۔ تم سب باتوں کے زور سے ہی تجربہ سنتے ہو۔"

متھرا: "دل اگر دکھانے کی چیز ہوتی۔ تو دکھا دیتا۔ کہ میں تمہیں کس قدر پیار کرتا ہوں۔ جب تمہارے پاس رہتا ہوں۔ تب بھی تمہارا ہی رہتا ہوں۔ اور جب نہیں رہتا۔ اسوقت بھی تمہارا ہی بنا رہتا ہوں۔ کہنے سے تم یقین کیدیا نہ کرو۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ تمہیں میں اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔"

یہ بات سنکر شیاما کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہنستے اس نے متھرا ناتھ کے بائیں شانہ پر اپنا سر رکھدیا۔ اس وقت بھی اس کی ہنسی کم نہیں ہوئی تھوڑی دیر بعد بولی۔ "میں جانتی تھی۔ کہ تم چڑھو گے۔ اور ایک بار کہکر تمہیں رُلا سکتی ہوں۔ تم مجھے پیار کرتے ہو۔ کیا میں یہ نہیں جانتی۔ میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ اتنے دنوں تک تمہاری جدائی میں جو دکھ اٹھایا۔ اس کی حد نہیں۔ اُسی دُکھ سے میں نے اتنی باتیں کہیں۔ مگر اب میرا وہ دُکھ دور ہو گیا ہے۔ اب میں اُسے خیال میں نہ لاؤں گی۔ دُکھ نہ ہو۔ تو سُکھ کہاں نصیب ہو۔ اس قدر دُکھ اٹھایا ہے۔ اسی لئے تو سُکھ پا رہی ہوں۔ اب یہ بتاؤ۔ کہ تم مجھے چھوڑ دو گے تو نہیں۔ اور میرے ساتھ پہلے کی سی چال تو نہ کرو گے میں اب سیٹ گرام نہیں جاؤں گی۔"

متھرا ناتھ نے شیاما کو گلے سے لگا لیا۔ کتنی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے ہم آغوش رہے۔ اس کا علم کسی کو نہیں۔ بہت دیر بعد متھرا ناتھ نے کہا "شیاما! جس کی بیوی تمہاری جیسی ہو۔ اس دنیا میں وہی سُکھی ہے۔ باقی سب دُکھی ہیں۔"

کرتے زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دیتی۔ اس وقت مجھے اسی میں سکھ ہوتا۔ مگر پیارے ایشوا تمہیں نے تو میری سکھ کی خواہشات بڑھا دیں۔ اس وقت میرا دل تو اس سے آسودہ نہیں ہوگا۔ سکھ کے سمندر میں غوطہ دیکر پھر اگر دکھ کے جزیرہ میں غرقاب کرو گے۔ تو میں بہت دکھی ہوں گی۔ موت کے سوا اس حالت میں کبھی شانتی نہ ہوگی۔ میں تمہیں کسی طرح مجبور نہیں کرنا چاہتی۔ جو مناسب سمجھو کرو۔

ایشور نہ کرے کہ کوئی اور مصیبت آئے۔ پرماتی کیا تمہاری کوئی نہیں ہے۔ جسے دل و جان دونوں نذر کرنے کا عہد کیا ہے۔ اس سے کچھ پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری مصیبت میری ہی مصیبت نہیں ہے۔ تم کیا پرماوتی کا غم نہیں ہے۔ تب اس پر بھی مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت۔ مجھے اپنے دکھ کا حصہ دار کیوں نہیں کر لیتے۔ میں بیوی ہوں۔ تمہارے دکھ میں حصہ لینے کے ناقابل ہوں۔ کیا اسی خوف سے مجھ سے چھپاتے ہو؟ اس کا خوف نہ کرو۔ میں نے بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ اور بہت کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ جس دن ابھاگنی پرماتی تمہارے قدموں پر گر پڑی تھی۔ اور جس دن تم نے اس کے تمام پچھلے قصوروں کو معاف کر کے اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ وہ میری زندگی میں وہی دن رات تھا۔ وہ دن کیا پھر نہیں آئیگا۔ ہمیشہ کی تصویر اسے پرماتی کیا کبھی کبھی تمہارے قدموں میں قرار ثابت ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ تو تم نے جس دل سے میرے ان بڑے بڑے قابل اعتراض قصوروں کو معاف کیا تھا۔ اسی دل سے اسے بھی معاف کرنا اور مجھ سے کیا کہوں کہ کس طرح تم اس بدنصیب کے دل کی حالت کا اندازہ لگا سکو گے۔ دل کی اس حالت کا اظہار میرے لئے ناممکن ہے۔ اگر تم نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی ہوگی۔ اگر تم مجھے پیار کرتے ہو گے۔ تو چند گھنٹے پہلی تمہاری جدائی میں میرے دل کی جو حالت ہوتی ہے۔ اُسے بآسانی سمجھ سکو گے۔ اور اس کا اندازہ لگا سکو گے۔

اب کہو اور کتنے دنوں تک دور رہو گے۔ پھر تم نے جیسا سنا ہے ایشور کرے۔ ویسا ہی ہو۔ پھر بھی چہانتے کو اگر صحت ہو گئی ہو۔ تو دیر کرنے کی کیا ضرورت

ہے۔ پشپا کو میری یاد دلا دینا۔ بھگوان اُسے سکھی رکھے۔ تمہارے بغیر اگر پدما کا کلیان
ہو۔ تو میں اُسی میں خوش ہوں۔ تم ہر طرح مصیبتوں کے پنجے سے آزاد اور سکھی رہو گے۔
یہی اس داسی کی آرزو ہے۔"

نولکھا خط کو تمام و کمال پڑھ گئے۔ ایک ایک لفظ سے گویا پدماوتی کی پاک محبت
ٹپک رہی تھی۔ انہیں یہی احساس ہوا۔ بار بار وہ خط پڑھا۔ پدماوتی کے سکھ دکھ کے بارہ
میں بہت دیر تک سوچتے رہے۔ اس کے بعد خط کا جواب لکھنے بیٹھے۔ اور پدما کی
ہر ایک بات کا نہایت معقولیت سے جواب دیا۔ پدماوتی کو وہ بھولے نہیں۔ اور
کبھی بھی اُسے نہیں بھول سکیں گے۔ اُس کے سکھ کی طرف اُن کی ہمیشہ نظر رہتی ہے۔
ستقرناتھ کے اصرار سے خواہش نہ ہونے پر بھی وہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ یہ سب باتیں بھی
انہوں نے لکھ دیں۔

خط ختم کر کے نولکھا پھر اسی پرانے تفکر میں غوطہ زن ہو گئے۔ پدماوتی کے فکر اور خیال
نے ان کا دل چور چور کر دیا۔ رہ رہ کر پدماوتی یاد آتی تھی۔ اس کا کیا سبب ہے؟ پدماوتی انہیں
پیار کرتی ہے۔ اس کا وہ اچھی طرح تجربہ کر چکے تھے۔ کسی قسم کی ضرورت نہیں تھی۔ محبت
میں ایک عجیب خیز طاقت ہے۔ تم کسی شخص کو پیار کرو۔ وہ بھی تمہیں پیار کئے بغیر نہ رہیگا۔
تم خواہ کتنے ہی قصور کرو۔ وہ خاطر میں نہ لائیگا۔ محبت کی آنکھ عیب بین نہیں ہوتی۔ تمہارے
ذرا سے وصف کو بھی وہ ہمیشہ بڑھا کر دکھانے کی کوشش کریگا۔ انسان محبت کا دیوتا ہے۔ اپنا
سکھ ماتم پدماوتی کا ہو یا نہیں۔ پیار محبت تعلق خواہش عقیدت وغیرہ ہم
حتی الامکان موجود رہتے ہیں۔ ہر شخص کے دل میں کم و بیش محبت پوشیدہ رہتی ہے۔ موقع
پا کر وہ ابھرتی ہے۔ دل میں تھوڑی سی بھی محبت پیدا ہو جائے۔ موقع پاتے ہی وہ ابھر آئیگی۔
جس طرح جنگل میں ذرا سی آگ لگنے پر وہ تمام جنگل میں پھیل جاتی ہے۔ اور خطرناک صورت اختیار
کر لیتی ہے۔ خوشبودار پھولوں سے بھرپور بسنت کی رنگین دھانی کرنیں نورانی ہو کر ہر جا طرف محیط
ہو جاتی ہیں۔ آنکھ بند کرتے ہی نیند دھیرے دھیرے چپ چاپ آ کر دم کے دم
میں ہی جسم و جان پر اپنا اقتدار جما لیتی ہیں۔ اسی طرح کشت دل میں محبت کا اکھوا

پیدا ہوتے ہی تھوڑے ہی عرصہ میں سربفلک درخت کی سی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ نوکمار کا دِل پہلے ہی سے پدماوتی کو پیار کرنے لگا تھا۔ اس وقت اسی محبت نے رفتہ رفتہ ترقی کے راستے میں گامزن ہو کر اپنی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ہر جگہ محبت کا یہی قانون ہے۔ کوئی ایسا مذہب نہیں جہاں محبت کا راج نہ ہو سکے۔ کوئی ایسا دل نہیں جو محبت کا اثر قبول نہ کرے۔ اگر ایسا دل ہو۔ تو وہ دل نہیں۔ بلکہ ایک پتھر ہے۔ نوکمار کا دل محبت کا بحر بیکراں تھا۔ اسی دل سے انہوں نے پدماوتی کو پیار کیا تھا۔ کب وہ پیار اپنی جڑ نہیں پکڑ گیا۔

تو کیا اتنے دن بعد نوکمار کپال کنڈلا کو بھول گئے؟ نہیں۔ وہ آج تک کپال کنڈلا کو نہیں بھول سکے۔ زندگی بھر نہیں بھول سکیں گے۔ یہ ناممکن بات ہے۔ کپال کنڈلا پر نوکمار کا جو پریم ہے۔ اور پدماوتی کے ساتھ جو محبت ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کپال کنڈلا کی محبت پاک صاف اور شفاف ہے۔ گویا صاف شفاف پانی یا ہیرے کی چمک تھی۔ پدماوتی کی محبت میں نفسانیت چمک دمک اور حرارت تھی۔ گویا ایک شعلہ اور چمک دار روشنی تھی۔ دونوں ہی ضروری [illegible] مگر اس وقت نوکمار کے دل میں پدماوتی کی کشش زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ پدماوتی موجود ہے۔ اور کپال کنڈلا نظروں سے اوجھل۔ وہ کبھی ملے گی یا نہیں۔ یہ بھی امید نہیں۔ اس وقت کپال کنڈلا کی جو محبت تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ دھیمی ہو گئی تھی۔ محبت غائب ہونے والی شے نہیں ہے۔

تین دن بعد ایک روز نوکمار اور منتر آنند گھومنے گئے تھے۔ اسیوقت ان کی تلاش میں ایک برہمن کسی دوسرے گاؤں سے آیا۔ نوکر نے اُسے مناسب خاطر تواضع کیساتھ چنڈی منڈپ میں بٹھایا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں نوکمار اور منتر آنند بھی ٹہلکر آگئے۔ نوکر نے برہمن کے آنیکا ذکر کیا۔ خبر پاتے ہی نوکمار گئے وہاں پہنچکر انہوں نے جو دیکھا۔ اُس سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کپال کنڈلا اور نوکمار نے کپالی کے یہاں سے بھاگ کر جس کے ہاں ٹھہرکر پناہ لی تھی۔ اور ان کی جان بچائی تھی۔ اور جس نے کپال کنڈلا جیسا انمول رتن دیکر نوکمار کو سکھ کے سمندر میں پہنچا دیا تھا۔ نوکمار نے دیکھا۔ یہ وہی برہمن ہے۔ اور چنڈی کی دیوی کا پجاری ہے۔ فرط غم سے نوکمار کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ وہ سوچنے لگے جب پجاری جی سوال کریں گے۔ کپال کنڈلا کیسی ہے؟ اس وقت میں کیا جواب دونگا؟ اس فکر نے انہیں پریشان کر دیا۔

نوکمار نے پجاری جی کے قدموں میں جھک کر پرنام کیا۔ پجاری جی نے نوکمار کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "نوکمار! اس قدر غمزدہ کیوں نظر آتے ہو۔ سب خیریت تو ہے؟"

یہ فقرہ سنکر نوکمار کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔ پجاری جی ان کی یہ حالت دیکھکر دنگ رہ گیا۔ نوکمار نے کہا مہاراج میں سب باتیں کہتا ہوں۔ سنئے۔ یہ کہکر نوکمار نے پجاری جی کے یہاں سے کپال کنڈلا کو لانے کے بعد کا تمام قصہ کہہ سنایا۔ اور جس طرح کپال کنڈلا کی موت واقع ہوئی۔ وہ تمام حالات بھی گوش گذار کئے۔ یہ سب سنکر پجاری جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور کسیطرح بھی روکے نہ رکے۔

پجاری جی کپال کنڈلا کو بہت پیار کرتے تھے اور اُسے[1] "ماں" کہکر پکارتے تھے - کپالی کے برے ارادوں سے واقف ہو کر انہوں نے نوکمار کیساتھ کپال کنڈلا کی شادی کردی تھی - فی الحقیقت اگر غور کیا جائے تو کپال کنڈلا کا پجاری کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا - پجاری جی کے حالات سے بھی جہاں تک واقفیت ہوئی ہے - اُن کے بھی کوئی اولاد بیوی یا اور کوئی نہیں تھا - وہ کپال کنڈلا کو اپنی بچی سمجھ کر پیار کرتے تھے - اور کپال کنڈلا بھی پجاری کے سوا اور کسیکو نہ جانتی تھی - پجاری جی ہی اُس کے ماں باپ اور سب کچھ تھے - ایسے دو پیار کرنے والوں میں سے ایک کی ناگہانی موت کا واقعہ سُن کر ضرور دل ٹوٹ جاتا ہے اس میں شک ہی کیا ہے ؟ پجاری جی کو سخت صدمہ پہنچا - وہ بہت دیر تک روتے رہے اگرچہ نوکمار اور متھرا ناتھ نے انہیں ہر چند سمجھایا - مگر اُن سے ضبط نہ ہو سکا - کچھ دیر بعد ذرا شانت ہو کر بولے - "نوکمار! کپال کنڈلا کی قسمت بڑی کھوٹی نکلی - دیوی نے اسے کبھی سکھ نہیں دیا - بچپن ہی میں یتیم ہو گئی - ماں باپ کہاں ہیں گھر کہاں ہے - یہ بھی اُس نے نہیں جانا - تمہارے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی - سوچا تھا کہ ایک دن بیٹی سکھ کا مُنہ دیکھیگی مگر جب قسمت میں نہیں تھا پھر کیا ہوتا - تمام تدبیریں اُلٹی پڑ گئیں -"

نوکمار چُپ چاپ رونے لگے پجاری جی نے کہا - "نوکمار! اب رونے سے کیا حاصل ؟ تم خود دانا بینا ہو سمجھ نہیں - ایشور نے تمہیں اس قدر دُکھ کیوں دیا؟ پھر سے شادی کر کے تمہیں دُنیاوی زندگی بسر کرنی چاہیئے -

نوکمار کے مُنہ سے بات نہیں نکلی پجاری نے کہا - "آہا! اس میں جیسا حُسن تھا - ویسے ہی اوصاف بھی تھے - یکایک اُسے دیکھ کر دیوی کا گمان ہوتا تھا -"

نوکمار نے کہا :- کپال کنڈلا کا نام تو دُنیا سے اُٹھ گیا - اس کے متعلق کچھ ذکر کرنے سے کیا

---

[1] بنگالیوں میں پیار کی وجہ سے لڑکی کو "ماں" کہکر پکارتے ہیں ٭

میں کسی کو آگاہی نہیں۔ کپال کنڈلا خود اپنے حالات سے واقف نہیں تھی۔ آپ کچھ اس کے متعلق واقفیت رکھتے ہیں؟"

ایک لمبا سانس لیکر پجاری جی بولے:۔ "ان تمام آفات و مصائب کا شکار ہونا تھا۔ اسی وجہ سے دیوی نے سب کچھ میرے گوش گذار کرا دیا ہے۔ میں سب کچھ جان گیا"

نوکمار نے کہا:۔ "یہ تمام حالات جاننے کیلئے بعض اوقات طبیعت بہت بے چین ہو جاتی ہے۔ اس وقت ان باتوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی دوسرے وقت آپ سے سنوں گا۔"

اس رات کو پجاری جی وہاں ہی رہے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے اپنے گھر جانا چاہا۔ نوکمار نے کسی طرح بھی منظور نہیں کیا۔ بولے۔ جتنے دن آپ یہاں رہیں گے۔ اتنے دن ہم لوگ بھی رہیں گے۔ آپ اس وقت جا کر کیا کیجئیگا۔ وہاں کون ہے؟ ... کے دیکھے جائیں گے۔ چار پانچ دن میں ہی سب آرام ہو جاؤں گا۔ اسیوقت آپ بھی گھر چلئے گا۔ ایک مہینہ بعد میں پھر یہاں آ جاؤں گا۔ آپ بھی اتنے دنوں میں وہاں سے لوٹ آ سکیں گے۔ پھر یہاں ہی ملاقات ہوگی۔ پجاری جی نے منظور کر لیا۔

تیسرے پہر نوکمار مستعد آگئے اور پجاری جی سیر کرنے کیلئے روانہ ہوئے۔ اوڑیسہ کے جنوبی حصہ میں ایک گھنا جنگل تھا سب اسی طرف چلے۔ دونوں طرف جنگل سے ہو کر گاؤں میں جانیکا ایک راستہ تھا۔ وہ لوگ اسی راستہ سے ہو کر جانے لگے۔ ذرا دور چلنے پر ایک شخص کے کراہنے کی آواز تینوں کے کانوں میں پہنچی۔ سب چونک پڑے۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ مگر کوئی پتہ نہیں چلا۔ کراہنے کی آواز اور زور زور سے آنے لگی

وہ اُسی آواز کی طرف چلے۔ دو ہی قدم آگے بڑھ کر دیکھا۔ کہ پاس ہی ایک شخص دکھ سے چیخیں مار رہا ہے۔ درختوں اور جھاڑیوں میں گھس کر دہ لوگ وہاں پہنچے۔ پجاری اور لوکمار دونوں کے دل دہل گئے۔ کیا خوفناک نظارہ تھا؟ اُنہوں نے دیکھا۔ سمندر کے کنارے رہنے والا۔ کپال کنڈلا کا پرورش کنندہ بھیروی سیوک۔ جٹا دھاری کپالی موت کی تکلیف سے بے چین ہو رہا ہے۔ اُس کا آخری وقت قریب ہے۔ تھوڑی دیر میں طائر رُوح قالب خاکی سے پرواز کر جائیگا۔ اتنے دنوں تک بھیروی کی خدمت کر کے اس نے کیا پھل پایا؟ لوکمار اور پجاری دونوں سوچنے لگے۔ کہ کپالی یہاں کیوں آیا؟ یکایک اُس کی یہ حالت کیوں ہو رہی ہے؟ ان سب باتوں پر غور کرنا اِس وقت مناسب نہیں۔ وہ کپالی کے سامنے آ گئے۔ کپالی کی نظر اُن پر پڑی۔ لوکمار کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خون میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ تھر تھر کانپنے لگا۔

کپالی کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ دُکھ درد میں پھنسے ہوئے کپالی نے گویا انہیں دیکھ کر اطمینان پایا۔ ہاتھ کے اشارے سے اُن لوگوں سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ وہ بیٹھے۔ کپالی نے منہ پھیلایا۔ اُن لوگوں نے سوچا۔ وہ پانی مانگتا ہے فوراً مٹھرا اٹھ پانی لینے گئے۔ اور ذرا دیر میں ایک مٹی کا برتن پانی سے بھر لائے پجاری جی کپالی کے منہ میں قطرے قطرے پانی ٹپکانے لگے۔ پانی پاتے ہی کپالی میں کسیقدر بولنے کی طاقت آئی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی باتیں کرنے لگا۔ کپالی نے لوکمار کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پاپ ۔۔ ۔۔ اوہ ۔۔ ۔۔ قصور ۔۔ نرک ۔۔ ۔۔ جلتا ۔۔ ۔۔ بھول ۔۔ ۔۔ بھوانی ۔۔ ۔۔ مُعاف ۔۔ ۔۔ غیر ۔۔ ۔۔ ممکن ہے ۔۔ ۔۔ اُف! ۔۔ ۔۔ تو ۔۔ ۔۔ مُعاف ۔۔ بڑا ۔۔ دُکھ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جلا ۔۔ ۔۔ بدلہ ۔۔ ۔۔ آگ ۔۔ ۔۔ بچاؤ ۔۔ ۔۔ بچاؤ ۔۔ تو ۔۔ ۔۔ اوہ ۔۔ ۔۔ اب ۔۔ ۔۔ تمہیں ۔۔ ۔۔ اِتی ۔۔ ۔۔ ای ۔۔ ۔۔ ماتا! ۔۔ ۔۔ تمہارا ۔۔ ۔۔ ری ۔۔ ۔۔ اد ۔۔ ۔۔ لاد ۔۔ ۔۔ ہوں ۔۔ ۔۔ مُعاف ۔۔ ۔۔ کرو ۔۔ ۔۔ مرا ۔۔ ۔۔ آ ۔۔ ۔۔ آ ۔۔ ۔۔ آ

یہ کہتے کہتے کپالی کو غش آ گیا۔ پھر مُنہ پھیلانے پر پجاری نے پانی ڈالا۔ کپالی نے پھر کہا ۔۔ ۔۔ زندگی ۔۔ ۔۔ گئی ۔۔ ۔۔ نرک ۔۔ ۔۔ تدبیر ۔۔ کیا ہے؟ اوہ! ۔۔ ۔۔ مر ۔۔ ۔۔ تا

ہوں ۔۔ ۔۔ا ۔ بس ۔۔ ۔۔ بار ۔۔ ۔۔نہیں ۔۔ ۔۔"

لوکمار کے ہات سے کپالی نے اپنا ہات چھڑا لیا ۔ اور دونوں ہات جوڑ کر اونچی نگاہ کر کے کہنے لگا :۔

"ہاں ۔۔ ۔۔ معاف ۔۔ ۔۔کرو ۔۔ ۔۔ ۔۔ چرن ۔۔ ۔۔ دو ۔۔ ۔۔ مرتا ہوں ۔۔ ۔۔ مرا نرک ۔۔ ۔۔ ۔۔ میں ۔۔ ۔۔ نہیں ۔۔ ۔۔نا ۔۔ لا ۔۔ عق ۔۔ ۔۔ ۔۔اولاد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہوں ۔ چھوٹ ۔۔ ۔۔ پاپ ۔۔ کبھی ۔۔ ۔۔نہیں ۔۔ ۔۔ اوہ ۔۔ ۔۔ اوہ !! ۔۔ ۔۔چلا ۔۔ ۔۔ ماں ۔۔ ۔۔ نہیں ۔۔ ۔۔ جان ۔۔ ۔۔ تا ۔۔ ۔۔ تھا ۔۔ ۔۔ اب ۔۔ ۔۔ معاف ۔۔ کر ۔۔ دو اوہ ! ۔۔ ۔۔ اب ۔۔ ۔۔ ۔۔ نہیں ۔۔ ۔۔ اوہ ! ۔۔ ۔۔ ۔۔"

تکلیف کی زیادتی سے کپالی بے چین ہو گیا تڑپنے لگا ۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔ بات چیت کرنے کی طاقت جاتی رہی ۔ اُس نے پھر منہ پھیلا دیا پجاری نے پھر پانی پلایا ۔ پانی پی کر لوکمار کا ہات پکڑ کر بولا "سچا ۔۔ ۔۔ ئی ۔۔ ۔۔ تو ۔۔ مرتا ۔۔ ۔۔ ہوں ۔۔ ۔۔ رنج ۔۔ ۔۔ تم ۔۔ ۔۔ کر ۔۔ ۔۔ و ۔۔ ۔۔ معا ۔۔ ۔۔ ف !" یہ کہکر کپالی خاموش سا ہو گیا ۔ اگرچہ کپالی بڑا ظالم اور ہیبت ناک شخص تھا ۔ لوکمار کو اُس نے بہت تکلیف پہنچائی تھی ۔ مگر پھر بھی لوکمار کا دل اُس کی ابتر حالت اور پریشانی دیکھکر پسیج اُٹھا ۔ وہ بلند آواز سے بولے :۔ "میں نے تمہیں معاف کیا ۔ دُعا کرتا ہوں کہ دیوی تمہیں معاف کرے ۔ کپالی بولا :۔ " ۔۔ ۔۔ تو ۔۔ ۔۔ اوہ ! ۔۔ ۔۔ کپال ۔۔ کنڈ ۔۔ ۔۔ لا ۔۔ ۔۔ لکشمی ۔۔ ۔۔ ۔۔ بچو ۔۔ ۔۔ ئی ۔۔ بستی ۔ ہوئی ۔۔ ۔۔ ہے ۔۔ ۔۔ ایں ! ۔۔ ۔۔ ۔۔ اوہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مرا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ماں ۔۔ ۔۔ اُو ۔۔ ۔۔ اُو ۔۔ ۔۔ رام ۔۔ ۔۔ اوہ ۔۔ ۔۔ چلا ۔۔ ۔۔ آ ۔۔ ۔۔ بچا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ئی ۔۔ مجھو ۔۔ ۔۔ ا ۔۔ ۔۔ ۔۔ بی ۔۔ ۔۔ ماں ! ۔۔ ۔۔ ۔۔ بچا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ئی ۔۔ ۔۔"

اس بات کو صاف صاف سننے کیلئے لوکمار اور پجاری دونوں ہی بیتاب ہو اُٹھے پجاری نے پوچھا ۔ کپال کنڈلا کی نسبت کیا کہتے ہو ؟"

کپالی نے بڑی مشکل سے کہا :"ہیں ۔۔ ۔۔ اسے ۔۔ ۔۔ اسے ۔۔ ۔۔ اسے ۔۔ ۔۔ اوہ ! ہاں ۔۔ ۔۔ کپا ۔۔ ۔۔ ل ۔۔ ۔۔ ۔۔ ل ۔۔ ۔۔ لا ۔۔" اس کے بعد باوجود کوشش کے بھی

سنسکار موزوں اور مناسب طریق پر کرنا چاہئے۔

یہ تجویز سب نے منظور کر لی۔ کپالی کی لاش گنگا جی کے کنارے پہنچائی گئی۔ اور وہاں اُس کی چِتا سجا کر اُسے آگ دی گئی۔ ستر نا سترک کپالی کا جسم آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو گیا۔ اور صفحۂ دُنیا سے اُس کا نام و نشان حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔

اگلے دن لونکا سیٹھ گرام کی طرف اور پجاری پلاسی کی سمت روانہ ہوئے۔ کپالی کے آخری الفاظ دونوں کے لوحِ دل پر نقش تھے۔
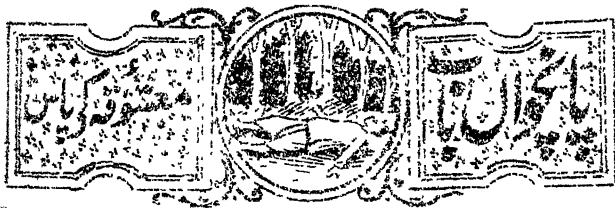
چند دنوں بعد پدماوتی پھر لونکا کے پہلو میں بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اب پدماوتی کو طلعت القمرا کے نام سے موسوم کرنا ضروری نہیں۔ اُس نام سے اب پدما کا تعلق نہیں۔ وہ اپنے مکان میں بیٹھی ہوئی ایک کتاب مطالعہ کر رہی تھی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ سب مکان کے دروازے بند تھے۔ مکان بڑا ہونے کی وجہ سے اُس میں تاریکی کا نام بھی نہیں تھا۔ پدماوتی ایک پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے آرام کر رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں کتاب اور دائیں ہاتھ میں تاڑ کا پنکھا تھا۔ وہ مطالعہ میں از حد محو تھی۔ جب گرمی زیادہ ستاتی تو پنکھا ہلانے لگتی تھی۔ پاس ہی پاندان میں کتھے کی پان لگے ہوئے رکھے تھے۔ جب جی چاہتی، کھا لیتی۔

عین اسی وقت مکان کا ایک دروازہ کھلا اور لونکا داخل ہوا۔ یکایک انہیں آتے ہوئے دیکھ کر پدماوتی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ سب کام چھوڑ کر وہ استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ اور اپنے پیتم پر جان سے نچھاور ہو کر اُس پاک چہرہ کی طرف اپنی نگاہیں گاڑ دیں۔

چند روز بعد لونکا نے پدماوتی کی خیریت دریافت کی۔ پدماوتی نے اُن کی ...

حیرت انگیز تبدیلیاں!! ایشور سب کچھ کر سکتا ہے۔ وقت پر سب باتیں ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد بولے: "پدماوتی! تم فرقۂ اناث میں بیش قیمت اور گراں بہا رتن ہو۔ تمہاری تمام باتوں میں امرت کا سا اثر ہے۔ اس کے دو چار قطرے سے ہی ایسی مستی اور سرور آجاتا ہے کہ میں بیخود ہو جاتا ہوں۔ یہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہے۔ تمہاری باتوں پر میں لطف اندوز ہوں گا۔"

پدما۔ "اچھا۔ جو ہو۔ تم نے کپال کنڈلا ...... "

"کپال کنڈلا" یہ لفظ سن کر نوکمار چونک اٹھے۔

پدماوتی بولی: کیا تم نے کپال کنڈلا کے بارہ میں کبھی کچھ سنا ہے

ایک لمبی سانس لیکر نوکمار نے کہا "کپال کنڈلا کی بابت اب کیونکر کچھ سنوں گا۔ اس کی ناگہانی موت نے صفحۂ ہستی سے اس کا نام حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اس کے بارے میں اب اور کیا کہوں؟"

پدما۔ "یا اس کے متعلق تمہیں کبھی کوئی شک ہوا ہے؟"

نوکمار۔ "شک و شبہ کی بات ہے۔ پدماوتی! شک کیوں ہونے لگا؟ میری بات پر اگر تم یقین کرتی ہو تو سنو۔ میں کہتا ہوں۔ کپال کنڈلا میرے سامنے میری آنکھوں کے آگے میرے ساتھ اتھاہ پانی میں کود پڑی ہے۔ میں نے پانی میں کود کر بھی اسے بچانے کی ہر چند کوشش کی۔ مگر میری تمام کوشش رائگاں اور بے سود ثابت ہوئی۔ کپال کنڈلا کہاں ڈوب گئی؟ اس کا پتہ میں نہیں پا سکا۔ بالآخر میرے ہوش و حواس بھی جاتے رہے؟"

یہ کہتے کہتے نوکمار کو پچھلی کی باتیں یاد آگئیں۔ دل میں بہت دکھی ہوئے۔ بڑی دقت سے آنسو روک کر بولے: "کیوں پدماوتی! آج یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟"

پدماوتی نے کہا۔ "ان تمام باتوں کے تذکرہ سے تمہیں دکھ ہوگا۔ یہ میں جانتی تھی۔ مگر کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ آج یہ تمام باتیں کیوں دریافت کر رہی ہوں اس کی نسبت سنو۔" یہ کہہ کر پدماوتی نے شروع سے انگوٹھی کا تمام قصہ من و عن سنا دیا۔

تمام باتیں سن کر نوکمار کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پدماوتی نے تمام حالات کہہ کر پوچھا "ناتھ! اس سے تم کیا سمجھتے ہو؟"

نوکمار ۔ کیا سمجھونگا ۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کپال کنڈلا ... نہیں ہے ۔ اور اس کا ہونا بھی غیر ممکن ہے ۔ مگر میری بدنصیبی ہے ۔ کہ میری مصیبتوں کا خاتمہ اب تک نہیں ہوا ۔ اسی سے وقت بے وقت کپال کنڈلا کے زندہ رہنے کے تعلق میں سایہ کی طرح ثبوت مل جاتے ہیں ۔ ان اثبات کی کوئی اصلیت نہیں ۔ صرف پریشان کرنے کے لئے ہی یہ باتیں سنائی دیتی ہیں ۔

پدما ۔ خواہ تم کچھ ہی کہو ۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کپال کنڈلا زندہ ہے ۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گئی ہے ۔

نوکمار :۔ پدماوتی ! ایسے دکھ دینے والے واقعات پر تم کیوں غور کرتی ہو ؟ میں بڑا بدنصیب ہوں ۔ میرے ہی دکھوں کی انتہا نہیں ہے ۔ دوسرے کی قسمت میں ایسا سکھ ہوتا ہو ۔ مگر وہ سکھ میرے نصیب میں نہیں ہے ۔ موہوم امیدوں میں کیوں تم بیٹھی تلاش کرتی ہو ۔ خواب میں اگر سکھ بھی ملا ۔ تو اس سے کیا فائدہ ؟

پدما ۔ کچھ ہو ۔ مگر کپال کنڈلا کی تلاش کرنی بہت ضروری ہے ۔

نوکمار نے مایوسانہ انداز سے کہا ۔ کہاں تلاش کروں ؟ کہنے کو تو یہ بات نوکمار نے کہہ دی ۔ مگر اسی وقت سے ان کے دل میں کچھ ایسے خیالات آنے شروع ہوئے ۔ کہ انہوں نے عہد کر لیا ۔ خواہ کتنی ہی تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔ مگر میں کپال کنڈلا کو پانے کے لئے سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرونگا ۔ ان کا دل یکایک چنچل ہو گیا ۔ [illegible] ہر چہار طرف کپال کنڈلا کا جلوہ ہی نظر آنے لگا ۔ دیگر تمام خیالات جاتے رہے ۔ جسم تک کپال کنڈلا نے ان کے دل پر اچھی طرح اقتدار حاصل کر لیا ۔ نوکمار نے اپنے دل میں اچھی طرح تلاش کی ۔ دیکھا ۔ ان کے دل میں صرف ایک ہی مورتی کا جلوہ نظر آیا ۔ وہ مورتی کپال کنڈلا کی تھی ۔ کپال کنڈلا تو کبھی کی مر چکی ۔ پھر کیوں اس کی مورتی آج نوکمار کے دل میں نظر آ رہی ہے ۔ نوکمار نے عہد کیا تھا ۔ کہ وہ تمام دنیا کو بھول جائیں گے ۔ اپنے آپ کو بھول جائیں گے ۔ دنیا کے تمام دکھوں کو خیرباد کہیں گے ۔ تاہم کپال کنڈلا کو کبھی اپنے دل سے دور نہیں کریں گے ۔ نوکمار کو اپنا وہ عہد نہیں بھولا تھا ۔ کبھی بھولیں گے

ہے۔ پدماوتی! کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ کوئی تمہارا دل دیکھ رہا ہے؟ توکمار تھوڑی دیر تک یکسوئی سے پدما کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پدماوتی نے جو باتیں کہیں۔ وہ دل سے کہیں۔ گویا اسی کا اندازہ لگانے کے لئے توکمار پدما کے منہ کی طرف دیکھ رہے۔ انہوں نے دیکھا۔ پدماوتی کی نگاہوں میں پاکیزگی اور سادگی کا جلوہ نظر آرہا ہے جس کا دل بدباطن ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ میں یہ جلوہ نظر آنا غیر ممکن ہے۔ پدما نے جو کچھ کہا ہے سب دل سے کہا ہے۔ توکمار نے سوچا "پدماوتی عورتوں میں ایک بیش بہا قیمت رتن ہے۔ خواہ ہزار تکلیفیں کیوں نہ اٹھانی پڑیں۔ مگر پدماوتی کے سکھی کرنے کی تدبیر کروں گا" اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ پدماوتی! بے فکر رہو۔ تمہیں کس کا خوف ہے۔ تمہیں ہر حالت میں توکمار سکھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

بہت دیر بعد توکمار بولے۔ "پیاری پدما! بہت دن ہو گئے۔ آنجی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ذرا ان سے مل آؤں" یہ کہکر توکمار اٹھ کھڑے ہوئے۔

پدماوتی نے کہا۔ ابھی تم سے بہت سی ضروری باتیں کہنی ہیں۔

توکمار نے کہا۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو بعد میں کہنا۔

پدماوتی بولی:- بہت اچھا۔

توکمار چلے گئے۔

جس مصیبت میں گرفتار ہو کر راجپوت لاپتہ ہو گئے تھے۔ ان تمام حالات سے ہمارے ناظرین واقف ہیں۔ بچا یا کچھ ایسا ہوا۔ جو ان کے مارے بھی نہیں جا سکے انہوں نے بہت سی جگہ آدمی بھیجے۔ مگر کہیں ان کا پتہ نہ چلا۔ کوئی ان کے حالات

پر روشنی نہیں ڈال سکا۔ اُس وقت ہری ہر نے سوچا۔ یقیناً وہ سیت گرام گئے ہیں۔
اسی خیال سے وہ دُوسرے ہی دن سیت گرام پہنچے۔ وہاں بھی آنا پتی نہ تھے۔ آنا پتی کی
ماں نے بھی تمام حال سُنا۔ وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر کر ہری ہر آنا پتی کی تلاش میں نکلے۔
دوسرے دن نوکمار تیسرے پہر آنا پتی سے ملاقات کرنے گئے۔ اُن کی ماں سے ملے۔ اُنہوں
نے رو رو کر تمام حال سُنایا۔ نوکمار کے سر پر جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ فرطِ غم سے آنسو
نکل پڑے جنہیں باوجود ضبط و کوشش بھی نہ روک سکے۔ ضعیفہ کی گریہ و زاری سُن کر
نوکمار کا جی پگھل کر پانی ہو گیا۔ آنا پتی کی یہ حالت سُن کر اُن کے زخمِ دل پر اور بھی
نمک پاشی ہوئی۔ آنا پتی کی ماں کی حالتِ زار دیکھ کر انہیں اور بھی صدمہ پہنچا۔ اُنہوں
نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ماں! تم گھبراؤ نہیں۔ خوف کی کیا بات ہے؟ میں اچھی
طرح جانتا ہوں قسمت کے پھیر سے آنا پتی کی یہ حالت ہوئی ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے
کہ انہیں کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا۔ میں تمام دُنیا چھان ماروں گا۔ جان دوں گا۔ غرض جس
طرح ہو گا۔ آنا پتی کو لا کر تمہاری گود میں بٹھا دوں گا۔ تم نہ گھبراؤ۔ تمہیں میری قسم۔"

آنسو پونچھ کر ضعیفہ نے کہا: "بیٹا نوکمار! تم جُگ جُگ جیو۔ کیا کہوں! ایک لڑکا اِسی
طرح سے لاپتہ ہو گیا۔ وہ آنکھ تھا۔ ایک آنکھ جاتی رہی۔ کوئی کیا کرے گا۔ سب اپنی قسمت کی کمائی
ہے۔ نوکمار! تم کہاں جاؤ گے؟ تم میں اور آنا پتی میں کوئی فرق نہیں۔ میں تمہیں کسی
مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔"

بات کاٹ کر نوکمار نے کہا "ماں! تم یہ کیا کہتی ہو۔ میں کس طرح بے فکر رہوں گا۔" یہ
کہہ کر آنا پتی کی ماں کے قدموں میں سر جھکا کر نوکمار وہاں سے روانہ ہوئے۔ سب سے
پہلے وہ پدماوتی کے پاس پہنچے۔ اور بولے: "پدماوتی! کچھ آنا پتی کا بھی حال سُنا ہے؟"
پدما نے کہا: "نہیں کچھ تو نہیں سُنا۔"

نوکمار نے تمام حالات پدماوتی سے کہہ دیئے۔ اس کے بعد بولے "پدما!
کل صبح میں آنا پتی کی تلاش میں جاؤں گا۔ کب واپس آؤں گا۔ اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا
سکتا۔ تم سے کچھ باتیں کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر وہ بہت ضروری ہوں۔ تو کہو۔"

پدما کھڑی تھی - یہ باتیں سن کر بیٹھ گئی - سر پر جیسے بجلی گری - اپنی پھوٹی قسمت پر لعنت و نفرین بھیجتی ہوئی بولی " ناتھ! میں خوب جانتی ہوں کہ اُماپتی تمہیں بہت عزیز ہیں - اُن کی مصیبت تمہاری مصیبت ہے - مگر یہ تو کہو کہ تم جاؤ گے کہاں؟ اگر کسی خاص جگہ کا پتہ معلوم ہوتا - تو اسی وقت جانا مناسب تھا - مگر جب کوئی ٹھیک ٹھکانہ ہی نہیں - تو کہاں جاؤ گے؟ اور کیا کرو گے؟ میں تمہیں اپنے فرائض کی انجام دہی سے کسی طرح باز نہیں رکھنا چاہتی - اور نہ اس میں رکاوٹ ثابت ہونا چاہتی ہوں - مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ذرا یہ تو سوچو "

نوکمار نے کہا " تم جو کہتی ہو - وہ ٹھیک ہی ہے - مگر میں خاموش کیونکر رہ سکتا ہوں اگر تم اُماپتی کی بوڑھی ماں کی گریہ وزاری دیکھتیں - تو یقیناً میری طرح تم بھی سب کچھ بھول جاتیں - کیا کروں - اور کوئی تدبیر نہیں ہے - کل صبح ہی گوپال چندر اُماپتی کے ماموں کے پاس جاؤنگا - وہاں پہنچ کر اگر کچھ کر سکا - تو بہتر ہی ہے - ورنہ واپس آؤنگا - اس کے علاوہ اگر اور کوئی تدبیر ہو - تو بتاؤ - "

پدماوتی بہت دیر تک سوچتی رہی - اس کے بعد بولی " میں تمہارے کام میں کسی طرح مخل انداز ہونا نہیں چاہتی - جاؤ - ایشور تمہیں کامیابی دے - کسی دوست پر مصیبت آئی ہوئی دیکھ کر خاموش بیٹھے رہنا مناسب نہیں - جاؤ - مگر ایک کام کرنا مجھے بھی خبر دیتے رہنا "

نوکمار نے پھر سوچا - پدماوتی عورتوں میں ایک گراں بہا رتن ہے - پہلے بھی پدماوتی کی نسبت انہوں نے ایسا ہی سوچا تھا - اس مرتبہ مزید تشفی ہوگئی - انہیں معلوم ہوا کہ پدما پاکیزگی ہمدردی اور سادگی کی ایک مجسم تصویر ہے - کون کہتا ہے کہ پدماوتی کلنک کا ٹیکہ جو کہتا ہے - نوکمار اس کے ساتھ لڑنے کیلئے تیار ہے - نوکمار نے پدما کے دل میں کلنک کا ایک چھوٹا سا داغ بھی نہیں دیکھا - محبت کی نگاہیں ایسی ہی ہوتی ہیں - یہ کوئی نئی بات نہیں ہے -

یونانی محبت کے دیوتا کیوپڈ (Cupid) کو اندھا کہتے ہیں - دوسرے فرقہ

کے بعض لوگ کہتے ہیں محبت کے دیکھنے والے سلیمان وغیرہ بمقابلہ چشمہ چیتے والوں سے دُوربین کی نظر سے بھی زیادہ تیز ہے - یہ دونوں ہی جداگانہ رائیں ہیں - اور دونوں ہی قابلِ اعتراض اور سچی ہیں - ایک کے خیال میں محبت بالکل اندھی اور دوسرے کے خیال میں محبت نور سے بھرپور ہے - اہلِ محبت اپنے پیار کرنیوالوں کے عیب پر نظر نہیں ڈالتا - وہ اس کی معمولی سی خوبی کو بڑا سمجھتا ہے - نوکمار نے اکتا کر پوچھا :- "پدماوتی ! کیا کہتی تھیں ہو" پدماوتی نے کہا :- "کہتی ہوں" یہ کہکر اُس نے ایک بکس سے ایک سربمہر خط نکالا - اس پر نوکمار کا پتہ لکھا ہوا تھا - وہ لفافہ نوکمار کے ہاتھ میں دیکر پدماوتی نے کہا "تھوڑے دن ہوئے شاہنشاہ جہانگیر نے مجھے بھیجا ہے" "بیتابی کیساتھ نوکمار وہ خط پڑھنے لگے *

رات بہت جا چکی تھی - تمام گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا - صرف کتے رہ رہ کر دُور کے درختوں کی سرسراہٹ یا اور کوئی آواز سُن کر بڑے زور سے بھونک رہے تھے یا یکایک کوئی پرند گھونسلے سے نکل کر تھوڑی دیر کے لئے اپنی آواز سے قدرت کے سناٹے کو توڑ کر پھر اپنے گھونسلے میں چلا جاتا تھا - ہم پر گھگو وغیرہ بھیانک پرند اپنی خوفناک آواز سے ماں کی گود میں سوئے ہوئے بچوں کے دل میں خوف پیدا کر دیتے تھے - اور بیچ بیچ میں شانتی دینے والا پہرہ دار بلند آواز سے پکار کر اپنی حاضری کا ثبوت دیتا ہوا گاؤں کی رکھوالی کر رہا تھا - اس کے علاوہ چاروں طرف سے پتوں کی سرسراہٹ کا نغمہ آہستہ آہستہ نکل رہا تھا - رات کے اس پرسکون سناٹے میں پتوں کی یہ سرسراہٹ اور بھی خوفناک معلوم ہوتی تھی - چاندنی چھٹکی ہوئی تھی - چاند کی صاف شفاف روشنی نے

تمام دنیا پر ایک نور کی چادر بچھا دی تھی۔ تمام دن کے تھکے ماندے انسان اس وقت نیند کی گود میں آرام کر رہے تھے۔ اور طرح طرح کے دکھ سکھ سے بھرے خواب میں خیالی نظارو سے محفوظ ہو رہے تھے۔ فاقہ کشی سے تنگ آیا ہوا مفلس خواب کے پُرلطف نظاروں سے محفوظ ہو کر دم بھر کے لئے شاہی عیش و آرام کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اور کوئی فرمانروا انگوٹی لگائے در بدر گداگری کر کے تھوڑا سا اناج لاکر پیٹ بھرنے کی کوشش میں سرگرم تھا۔ اسے خواب تو کسی پاپی۔ بدمعاش کو سکھ سے بھر پور سورگ میں پہنچا دیتے تھے۔ اور کسی نیک مرد شخص کو نرک میں پہنچا رہے تھے۔ خواب کی لیلا کیسی عجیب و غریب ہے سچ کو جھوٹ۔ اور جھوٹ کو سچ۔ عالم کو جاہل اور جاہل کو عالم۔ دولتمند کو مفلس اور مفلس کو دولتمند۔ نوجوان کو ضعیف اور ضعیف کو نوجوان بنا دیتا ہے۔ اس کی طاقتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ رات! راجہ چیپن کی سکھی نیند اور اس کی بیٹی سوپن دیوی تینوں مل کر دنیا کو کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہیں۔ رات کی سیاہ چادر زیب تن کرکے کتنے ہی سنگدل ڈاکو بے دردی کے ساتھ دوسروں کا خون کر کے ان کا مال لوٹتے ہیں کتنے ہی بدمعاش موقع دیکھ کر کئی وسیلے میں عفت پرست ستی کا سرمایۂ عصمت لوٹ لیتے ہیں خوفناک بھالو وغیرہ خون چوسنے والے جانور اپنا پیٹ بھرنے کیلئے اس وقت کتنے جانداروں کی جان لیتے ہیں۔ اے رات! تیرے آنے سے کتنی ہی پریشان خاطر ہستیاں مطمئن بھی ہوتی ہیں۔ مگر ان لوگ پاپ کے راستہ میں اس قدر سرگرمی کیوں دکھاتے ہیں۔ دنیا میں ایسا اندھیر کیوں ہے؟ ٹھکا سکھ کی نیند سو رہے تھے۔ مگر ان کی نیند کیوں اچٹ گئی۔ وہ انا جی کا خیال آتے ہی پریشان ہو گئے۔ ایسی حالت اور فکر میں بھی آخر نیند نے ان کی مدد کی۔ گویا وہ تھپیڑو سے چھوٹ کر آزاد ہو کر کاشانۂ راحت میں پہنچ گئے۔ اور طرح طرح کے پر سرور خواب نوشیں کا مزہ لوٹنے لگے۔ پھر یکایک آنکھ کھل گئی وہ علی الصباح انا جی کی تلاش میں جانے والے تھے۔ نیند اچٹتے پر وہی بستر استراحت کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ نہ معلوم کیا جی میں آیا۔ وہ اٹھ بیٹھے اور چراغ کی روشنی میں پدما کا دیا ہوا خط پڑھنے لگے۔ اس خط کا مضمون مختصر طور پر یہ تھا۔

"شاہنشاہ جہانگیر بہادر کی جانب سے بندہ آداب بجا لاکر عرض پرداز ہے کہ گو حضور کے دربار میں آپ کو شرف باریابی کا موقع نہیں حاصل ہوا تاہم جہاں پناہ آج سے آپ کو اپنا دلی دوست سمجھیں گے۔ اگر آپ اس کا سبب جاننا چاہیں۔ تو وہ بعد میں معلوم ہو جائیگا۔ اس وقت حضور والا شان کے حکم کے بموجب بطور یادگار ایک جاگیر عطا فرمانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس جاگیر سے آپ کو ایک لاکھ کی آمدنی ہوگی۔ آپ اگر اسے قبول کریں گے تو حضور بہت خوش ہوں گے۔ حضور ممدوح الشان کو آپ کے حالات سے واقفیت رکھنے کی بڑی خواہش ہے۔ اس لئے آپ اُن کے ساتھ نامہ و پیام ضرور جاری رکھیئیگا۔ فضل الٰہی سے جہاں پناہ بہت اچھی طرح ہیں۔ اُن کا نوازشنامہ بہت جلد آپ کی خدمت میں پہنچیگا۔

فرماں بردار
غیاث الدین خاں[1]

۲۹ رمضان

لوکمار نے کئی مرتبہ اُس خط کو پڑھا۔ وہ متحیر رہ گئے۔ لوکمار ایک معمولی شخص اور جہانگیر ہندوستان کے فرماں روا۔ دونوں میں اتنا فرق! ایسے وقت میں۔ اور غیر اُمید میں دوستی! لوکمار کو دولت مند بنانے اور اُن کے ساتھ دوستی پیدا کرنے کے لئے اتنی کوشش کیوں؟ لوکمار بہت دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے۔ وہ پدماوتی کے تمام حالات سے واقف تھے۔ سمجھ گئے کہ پدماوتی کے ساتھ بادشاہ کا پُرانا تعلق ہی اس کا خاص سبب ہے۔ اس سے اُن کے دل میں کوئی خوشی ہوئی یا نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ بہت دیر بعد لوکمار اُٹھے۔ اور خط کو سرہانے رکھ کر پھر سو گئے۔

بستر گویا فکر کا گھر ہے۔ جنہیں فکر کے چکر میں آنا پڑتا ہے۔ وہ خوب جانتے ہونگے کہ جس وقت انسان رات کو نیند کا انتظار کرتا ہے کمبخت فکر اُسی وقت آکر گھیر لیتی ہے۔ اور بہت پریشان کرتی ہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر فکر نے لوکمار کو دبوچ لیا۔ آنکھ بند کرکے وہ زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ خواہش غصہ۔ رنج و غم کا سمجھاؤ ہی ہی

[1] ہندوستان کی تواریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ غیاث الدین جہانگیر کا خاص منشی تھا درحقیقت نورجہاں اسی کی بیٹی تھی۔

جب کسی وجہ سے اُن میں سے کوئی ایک پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت آہستہ آہستہ اُس سے تعلق رکھنے والے تمام اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ نوکمار کیساتھ بھی ایسا ہوا۔ خیالات خام اور خواہش بد سے پیدا ہونے والی جتنی باتیں تھیں۔ تمام یاد آنے لگیں۔ نوکمار اسی طرح دنیا کے تفکر میں غرق تھے۔ کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ نوکمار نے سُنا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے پھر اجنبی لہجہ میں کسی نے اُن کا نام لیا۔ آواز نوکمار کی پہچانی ہوئی تھی۔ پکارنے والا کون ہے؟ یہ نوکمار تجوبی سمجھ گئے۔ جلدی جلدی بستر سے اُٹھ کر آنے والے شخص سے ملنے گئے۔

اب رات نہیں ہے۔ جاؤ۔ تم لوگ سو رہو۔ اب اس کے منہ کو بند رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ چیں چپڑ کی۔ تو اسی وقت تلوار سے سر اڑا دیں گے۔ اور قصہ تمام ہو جائے گا۔ یہ باتیں سن کر اناپتی نے اندازہ لگایا۔ کہ وہی سرگروہ ہے۔ سب چل کر اناپتی کو کھینچ کر اس مکان میں لے گئے۔ اور منہ کھول دیا۔ اناپتی کی سانس بڑی مشکل سے آتی تھی۔ انہیں سخت تکلیف تھی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگے۔ طاقت گھٹ جاتی رہی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ پھر بولنے کی طاقت آئی۔ اناپتی نے پوچھا "اس جگہ کا نام کیا ہے؟"

ان شخصوں میں سے ایک نے چڑ کر بولا "اس سے تمہیں کیا کام ہے؟" اناپتی نے پھر پوچھا "مجھے اس طرح جکڑ رکھنے کا کیا سبب ہے؟"

جواب "جس کے حکم سے جکڑے گئے ہو۔ اسی سے پوچھ لینا"

اُما "وہ کون ہے؟"

جواب "ہم لوگوں کے راجہ ہیں"

اُما "ان کا نام کیا ہے؟"

جواب "تم نہیں جانتے۔ ان کا نام کون نہیں جانتا تم کہاں رہتے ہو؟"

اُما "بستی گرام میں!"

جواب "اس گاؤں میں تو ایسا کوئی نہیں جو ہمارے مالک کا نام نہ جانتا ہو۔"

اُما "نام بتاؤ۔ پھر بتا سکوں گا۔ کہ پہچانتا ہوں یا نہیں"

جواب "جانو یا نہ جانو۔ مگر جب تمہیں معلوم ہی نہیں ہے۔ تو بتانے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

سب سے بڑے [illegible] نے کہا "[illegible] کیا ہے؟"

پہلے نے [illegible] کہا "[illegible] جو نام [illegible] جانتا [illegible]

وہ بھی [illegible] بیٹھ [illegible] تھا [illegible]"

[illegible] اناپتی نے [illegible] بات رکھا۔ ان کی زندگی کی امید جاتی رہی [illegible]

بچنا مشکل ہے۔ [illegible] کیسا خوفناک شخص ہے [illegible] مگر [illegible]

ان دنوں ملک میں ڈاکوؤں کا بڑا زور تھا۔ ڈاکوؤں کے مختلف فرقے تھے۔ ان سب میں رحیم کا جتھا بہت زبردست تھا۔ اُس زمانے میں ایسا کوئی نہ تھا جو رحیم کا نام نہ جانتا ہو۔ ماں کی گود کے بچوں سے لیکر سفید ریش بوڑھے تک رحیم کا نام سنکر کانپ اُٹھتے تھے۔ رحیم کے ظلم سے اُن دنوں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ اُس کے آدمی جہاں جس کو جیسے چاہتے تھے۔ لوٹ لیتے تھے۔ روک تھام کیلئے سرکار نے بھی کچھ کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ بادشاہ نے حکم دیدیا تھا کہ جو شخص رحیم کا سر کاٹ لائے گا۔ اُسے دس ہزار انعام ملیں گے۔ اس انعام کو حاصل کرنے کی غرض سے بہت سے لوگ اُسے گرفتار کرنے کی کوشش میں تھے۔ مگر کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا۔ کہ رحیم کا گروہ ہمیشہ ایک جگہ نہیں رہتا تھا۔ اس لئے کوئی اُسکا پتہ نہیں پا سکتا تھا۔

اُنا بچی رحیم کا نام سنکر خائف ہو گئے۔ وہ اس وقت رحیم کے جنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ پھر بچاؤ کہاں؟ اُنا بچی نے کچھ اور باتیں پوچھنے کیلئے سر اُٹھایا۔ دیکھا کہ وہ سب دروازے بند کر کے چلے گئے ہیں۔

قیدخانے کی حالت دیکھنے کے لئے انہوں نے ایکبار ہر جیا ہوت نظر ڈالی۔ مگر گھٹا ٹوپ تاریکی کی وجہ سے کچھ نہیں دیکھ سکے۔ صرف ہوا آنے جانے کیلئے ایک راستہ تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ راستہ بھی ڈاکوؤں نے ہوشیاری سے بند کر دیا تھا۔ پسینہ کی وجہ سے اُن کا تمام جسم تر بتر ہو گیا۔ بہت دیر تک منہ بند تھا۔ اس کے دکھ اور ناپاک ہوا کی تکلیف سے اُن کی حالت مُردوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ ایشور کا نام لیتے لیتے اُنا بچی زمین پر لیٹ گئے۔

مصر کی مشہور ہی کی ڈاکوؤں سے جنگل کے تہ خانے میں پڑا ایک نہایت ہی دلفریب کا مقام تھا

پیدا کر دیا تھا۔ تمام رات کی مسافت طے کرکے تھکا ماندہ چاند زردی مائل ہو کر آرام کرنے چلا۔ مشرق آسمان کے نچلے حصّہ میں سراپا نور درخشاں کملی کے چاند کی طرح سونے کا سا رنگ اختیار کئے ہوئے آفتاب طلوع ہوا۔ رات کو جن پتوں پر شبنم پڑی تھی۔ اُن میں تاؤ کھا کر وہ طلائی رنگ جگمگا اُٹھا۔ اور عمیق سمندر کے سیپ کی صاف شفاف موتیوں کی طرح شبنم کی بوندیں موتیوں کو شرمانے لگیں۔ اور رات کی تاریکی پردہ نشین عورت کی طرح گوشہ میں چھپ کر سورج کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔ ہوا کے سرد جھونکوں سے درختوں کی شاخیں اور بیلوں کی ٹہنیاں اور کنج کے کیطرح شگفتہ کمل میں نئی زندگی آگئی۔ ساتوں سمندروں میں چہچہانے والے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل کر عالم فضا میں اپنی بلند پروازی کا تماشہ دکھانے لگے۔ ہر جگہ منور۔ دلکش اور دلفریب نظر آنے لگی۔ صبح کے وقت طلوع آفتاب کی قدرتی نیرنگیاں جو نہیں دیکھتا۔ اُس کی آنکھ بے فائدہ اور زندگی بے سود ہے۔ قدرت کی ضخیم کتاب کے صفحہ کی ہر ایک سطر قابل مطالعہ ہے۔ وہ نہایت دلچسپ و دلکش اور دلآویز ہے۔ بالخصوص اُس کا یہ صفحہ نہایت ہی تحیّر انگیز ہے۔ آہستہ آہستہ تمام جنگل منور ہو گیا۔ ایک ایک کرکے تمام ڈاکو جاگے۔ رفتہ رفتہ دھوپ بھی پھیلنے لگی۔ رحیم نے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اپنے تمام ساتھیوں کو بلایا۔ وہ سب رحیم کے گرد جمع ہو گئے۔ تعداد میں وہ بیس سے کم نہ تھے۔ رحیم نے اُن سب کو مخاطب کرکے کہا "اب یہاں زیادہ دیر کرنے سے ہم لوگ تمام کے تمام مصیبت میں پڑیں گے۔ ہمارا تو ارادہ ہے کہ آج ہی یہاں سے کوچ کر دیں۔ تم سب کیا کہتے ہو؟"

سب یک آواز سے بول اُٹھے۔ جی ہاں! آج ہی!"

رحیم نے پھر کہا "ایک کام ہے۔ کل ہم لوگ جسکے گھر گئے ہیں۔ اُس نے ہماری کتنی بے عزتی کی ہے۔ یہ تم لوگوں سے کہہ چکا ہوں۔ اُسے مارنا ہوگا۔ یہ کام اسی وقت کر لینا چاہئے۔ اُسے لے آؤ۔" سب نے اس میں اپنی رضامندی ظاہر کی۔ تین شخص اُسکی بات کو لانے چلے صرف ایک شخص اس تجویز سے خوش نہیں ہوا۔ وہ شخص قطعی طور پر خاموش رہا۔ رحیم نے بھی یہ دیکھا اُس نے اُس کو پاس بلا کر کہا۔ دلبر! تم کیا کہتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے۔ تم ہماری رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔"

دِلبر نے کہا: "یہ کون سی بات ہے میری رائے کبھی آپ کے خلاف ہو سکتی ہے؟"

حسیم نے کہا: "کیوں دلبر! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو؟ جب سے تم ہمارے گروہ میں شامل ہوئے۔ اُس وقت سے میں ہمیشہ سب کے مقابلہ میں تمہاری رائے کو وقعت دیتا ہوں۔"

دِلبر نے عاجزانہ انداز سے کہا: "آپ کی مجھ پر از حد عنایت رہتی ہے۔"

حسیم:۔ "تمہارا مُنہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم نے اور ہی کچھ سوچ رکھا ہے۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟"

اُس گروہ میں دِلبر سب سے زیادہ معتبر ہیں اور دانش مند سمجھا جاتا تھا۔ اِسی وجہ سے حسیم ہمیشہ ہر بات میں اُس سے رائے لیا کرتا تھا۔ آج بھی دلبر کیسا تھا اُس نے خاص طور پر مشورہ لیا تھوڑی ہی دیر میں ڈاکو اُماپتی کو لے آئے۔ اُماپتی کے چہرے سے سنجیدگی استقلال اور لاپروائی کا اظہار ہوتا تھا۔ گویا وہ ان مصیبتوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ جو ایسے موقعوں پر مردانہ استقلال اور لاپروائی سے کام لیتے ہیں۔ اُماپتی کے دِل کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں۔

اُماپتی کے آتے ہی سب کی نظریں اُن پر پڑیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر سب چونک اُٹھے۔

اُماپتی نے بھی ایک ایک کر کے تمام ڈاکوؤں کے چہرے پر اپنی نظریں ڈالیں۔ آہستہ آہستہ اُن کی نگاہ دلبر پر بھی پڑی۔ وہ اُس کی طرف جانے پہچانے شخص کی طرح دیکھنے لگے۔ دلبر کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اِس لیے اُس نے اپنا منہ پھیر لیا اور ایک پتہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔

اس وقت کڑکتی ہوئی آواز میں حسیم نے کہا: "کافر! کیا سوچتا ہے۔ دُرگا کے نام کا جاپ کر لے۔ اب دیر نہیں ہے۔" بے خوف اُماپتی نے جواب دیا: "دیر نہیں ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں تم لوگوں سے رحم کی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ جو تمہارے رحم سے زندہ ہے اُس کی زندگی پر لعنت و نفرین ہے۔"

غصہ میں آ کر حسیم نے کہا: "تم ہم لوگوں کے رحم کا خواستگار نہیں۔ تو تم پر رحم کون کرتا ہے؟"

اُماپتی: "تم سب مجھے مار ڈالو گے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ میں بے مددگار اور کمزور ہوں۔ اِس لیے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ مگر تمہارا بھی بچاؤ نہیں ہوگا۔ حسیم! میری جان لیکر تم دُنیا میں مزے اُڑاؤ گے۔ مگر مالک کے یہاں یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی۔ اُس

وقت تمہیں کون پناہ دیگا ؟"

یہ سنکر رحیم زور سے ہنستے ہوئے طعن آمیز لہجہ میں بولا - ہندؤں کا خدا کہاں ؟ تم تو پتھر کی پرستش کرتے ہو - اور ہم لوگ اُس پر کھڑے ہو کر پاؤں دھوتے ہیں -

اُماپتی نے غضبناک لہجہ میں کہا "تم جاہل مطلق ہو - اس بات پر تم سے بحث کرنی فضول ہے مان لو کہ ہم لوگوں کا اعتقاد غلط ہے - اور ہمارا مذہب بھی توہمات سے خالی نہیں - پر تم لوگوں کا بھی تو مذہب ہے - اُس میں تو عذاب و ثواب کا خیال ہے "

رحیم نے ہنس کر کہا " کافر ! تم لوگوں کی جان لینے میں ہمیں گناہ نہیں ہوتا - ہم لوگوں کا مشرب ہے - کہ جہاں تک ہو سکے - کافروں کا قلع قمع کیا جائے - اس میں ہمیں ثواب عظیم ملیگا - اور ہمیں بہشت نصیب ہوگا "

اُماپتی نے کہا " بہتر یہ کہ تم سے بات چیت ... دونوں ملنے کی اُمید ہے - اس میں دیری کرنی مناسب نہیں "

بہت دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد رحیم نے کہا - دیکھو اکسی خاص وجہ سے آج کے لئے تمہاری جان بخشی ہوئی جاتی ہے - کل ضرور تمہیں مخلوق کی موت مرنا پڑیگا - تمہاری زندگی میں اب ایک ہی دن باقی ہے - آج کے دن منتر کا جاپ کرو " یہ کہکر رحیم نے چند مضبوط کو حکم دیا - کہ وہ پھر قید خانہ میں لیجائیں اور اچھی طرح سے جکڑ دئے جائیں - نوکر اُماپتی کو لے گئے - رحیم اور دلبر دونوں وہاں بیٹھے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے -
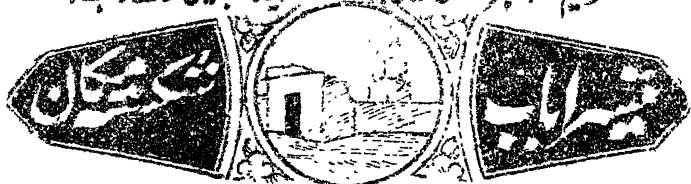
ڈاکوؤں نے بڑی احتیاط سے اُماپتی کے ہاتھ پاؤں جکڑ دئے اور اُنہیں اُسی مکان میں قید کر کے دروازہ بند کر لیا - اُماپتی نے دیکھا جس جگہ وہ مقید ہیں - وہ ایک شکستہ حال مندر ہے - مندر میں ایک چھوٹی سی شیوجی کی مورتی استھاپت تھی - ایک دروازے کے سوا

سانس لینے کا بھی کوئی راستہ نہ تھا ۔ وہ دروازہ بھی ڈاکوؤں نے بڑی احتیاط سے بند کر دیا تھا ۔ مندر
بالکل تاریک اور جا بجا سے ٹوٹا پھوٹا تھا ۔

اُماپتی نے نہایت ہی بھگتی بھاؤ اور عقیدت سے دیوتا کے چرنوں میں پرنام کیا ۔ اور کہا
"بھگوان! آپ کے مقدر میں اس قدر تکلیف ہے تمام دن میں ایک بیل پتر بھی آپ کی پوجا کے
لئے نہیں دیا جاتا ۔ بھوگ وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ سنگدل اور متعصب ہمیشہ آپ کے مندر
میں گھس کر اُن کی تقدیس کو بٹہ لگاتے ہیں ۔ اسے آپ خاموشی سے کیونکر برداشت کر لیتے
ہیں ۔ یہ سب وقت کی بات ہے ۔ آپ کا قصور نہیں ۔ کلجگ کی لیلا کے اثر سے دیوی دیوتا
دُنیا کو چھوڑ کر کسی روشن اور منور مقام میں آرام کر رہے ہیں ۔ اب اس پتھر کی مورتی سے آپ
کا کوئی تعلق نہیں ۔ بہت دن ہوئے ۔ آپ اسے چھوڑ چکے ہیں ۔ پرنتو! ہم لوگوں کی کیا حالت
ہوگی؟ آپ لوگوں کے چھوڑ جانے پر ہم لوگ کس کی شرن میں بھگوان! ہم لوگوں کا تو سہارا
نہیں ہے ۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولے "آپ سے یہ تمام باتیں کہنے سے دُکھ کم ہو جاتا ہے
قسمت میں جو ہے ۔ وہ تو پہلے سے ہی ٹھیک ہو چکا ہے ۔ اس وقت خواہ کتنا ہی بین و بلاپ
کیا جائے ۔ مگر اُس میں تبدیلی نہیں آسکتی ۔ پھر کیوں؟ دن رات بے فائدہ بین و بلاپ کرنے
سے بھی انجام میں تبدیلی کی اُمید نہیں ۔ کلجگ میں انسان کی نجات کے لئے جو تدبیریں بیان
کی گئی ہیں ۔ اُن میں کسی طرح کی تبدیلی ہونی ممکن ہے ۔ اس لئے خاموش رہنا ہی سب سے بہتر ہے

آہستہ آہستہ دوپہر ہوگئی ۔ شدت کی زبردست حرکت سے باہر جو ہو رہا تھا ۔ اُماپتی اُسے
نہیں جان سکے ۔ رہ رہ کر اُن کے کانوں میں کسی کے گانے اور چلنے کی آواز آتی تھی ۔ ساتھ ہی
سایہ میں آرام کرنے کے لئے شاخ پر بیٹھے ہوئے کوتے رہ رہ کر سنجیدہ مگر دھیمی آواز سے بول
اُٹھتے تھے ۔ یہ آواز بھی اُماپتی کے کانوں تک پہنچتی تھی ۔ مندر کی دیوار پر دو نوں آمنے سامنے
کھڑی ہوئیں ۔ یکایک ایک دوسرے کی طرف دوڑ پڑیں ۔ دونوں جب نزدیک ہوئیں ۔ تو ایک نے
دوسرے کی طرف منہ پھیر کر ٹک ٹک کی آواز نکالی ۔ آواز اُماپتی کے کان میں بھی پہنچی ۔ مگر وہ تمام
نظارے اُماپتی کے دل میں داخل نہیں ہو سکے ۔ کیوں؟ اُماپتی اس قدر مغموم کیوں ہو گئے

رہیں؟ اس کا جواب یہی ہے کہ ان کے دل پر فکر طاری تھی۔ موت کے کھلے ہوئے منہ کو اپنے سر
پر ہی دیکھ کر کون بے فکر رہ سکتا ہے۔ عزیز و اقارب اور وطن سے بچھڑ کر ان سفاک ڈاکوؤں کے
ہاتھ میری زندگی کا خاتمہ ہوگا۔ ان سے چھٹکارا پانے کی امید کرنا امید موہوم ہے۔ یہ سوچ کر
کس کے ہوش نہیں اڑ جائیں گے۔ کون بے فکر رہ سکتا ہے؟

اس قید خانہ میں بیٹھے ہوئے اُماپتی اپنے نصیب پر لعن طعن کر رہے تھے۔ کل ضرور
مرنا ہوگا۔ اس وقت کے آنے میں کتنی دیر ہے؟ یہی سوچنے لگے۔ سوچا۔ اب کیوں؟ موت کے
منہ سے جب رہائی پانی ہی نہیں ہے۔ تو پھر دیر کرنے کی کیا ضرورت؟ جتنی جلدی آ جائے۔ اتنا
ہی اچھا ہے۔ یہ حالت بڑی دکھ دینے والی ہے۔ اس کی نسبت موت کہیں بہتر ہے۔ اس
طرح سوچتے سوچتے وہ یکایک چونک اٹھے۔ اپنی بوڑھی روتی بلکتی ہوئی ماں کی مورتی صفحۂ یاد پر
منقش ہوگئی۔ طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ اُماپتی کو اپنی موت کی پرواہ نہ تھی۔ اگر یہی بات
ہوتی۔ تو جس وقت ظالم رحیم نے ان کی موت کا حکم دیا تھا۔ اسی وقت وہ بیہوش ہو جاتے۔ جو
ہونا تھا ہوا جو ہونے والا ہوگا۔ ہو کے رہیگا۔ جس کام میں کسی طرح تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی تھی
اس کے لئے انہوں نے کبھی بزدلی سے کام نہیں لیا۔ اس وقت ماں کی یاد آنے سے وہ کسی قدر
دکھی ضرور ہوئے۔ اپنی ماں کے وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ اُماپتی کے سوا ان کے اور کوئی اولاد نہیں
تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ ضعیف ہیں۔ اس وقت بیٹے کی جدائی میں انہیں کس قدر دکھ ہوا
ہوگا۔ انہیں خیالات نے اُماپتی کو پریشان کر دیا۔ بیٹے کی موت کی خبر پا کر ماں کی کیسی بری
حالت ہوگی۔ اُماپتی اپنی خیالی آنکھوں سے صاف صاف دیکھنے لگے۔ ان کا دل جلنے لگا
آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو گرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُماپتی نے ایک گہرا سانس لیا۔
فکر کی حالت ہی ایسی ہے۔ کہ ذرا بھی گمان نہیں ہوتا۔ مگر ایک فکر کے آتے ہی سینکڑوں
اَن گنت دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ نادانستگی میں ہی اُماپتی کے صفحۂ دل پر کمت کیشی کی مورتی
منقش ہوگئی۔ خیال آتے ہی وہ بیتاب ہو اٹھے۔ محبت گراں بہا شے ہے۔ جو محبتی ہیں
وہ جانتے ہیں۔ کہ محبت دنیاوی نعمت نہیں۔ بلکہ بہشتی نعمت ہے۔ وہی اندازہ لگا
سکتے ہیں۔ کہ اس رتن کی کیا قیمت ہے؟ اُماپتی کے سر پر ایک دو دھاری تلوار لٹک رہی

ہے - آج کی رات گذرتے ہی اُن کے جسم کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے - تاہم اس حالت میں مکت کیشی
کی یاد آتے ہی اُن کا دل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا - اُس کے تعلق میں تاتی ہی فکروں کی لہریں
اُن کے بحرِ دل میں اُٹھنے لگیں - اِس کا شمار نہیں ممکتا کی کمل جیسی صورت دیکھ کر وہ آنند
ساگر میں غوطے کھانے لگتے تھے - آج وہی شکل یاد آنے پر انہیں سخت تکلیف ہوتی تھی - وہ
اُس کی محبت کا انجام سوچنے لگے - سوچا - اُس کی محبت کا دریا بے پایاں ہے جس ممکتا کا پریم
اِس قدر پاک اور اتنا گہرا ہے مجھ سے زیادہ عرصہ تک جدا رہنے سے اُس کی تکلیف کا حد و حساب
نہ ہوگا - یہ سوچ کر وہ اور بھی بیتاب ہو گئے - کل اُن کا جسم مردوں کی تعداد میں اضافہ کریگا - یہ
سوچ کر انہیں جتنا دُکھ نہیں ہوا تھا - اُس سے کہیں زیادہ مکت کیشی کا خیال آنے سے ہوا -
عین اسی وقت نوکمار کی یاد نے بھی اُن کے دل میں ہلچل مچا دی - اگر سب کچھ دے کر بھی ایک بار
نوکمار سے ملاقات ہونے کی اُمید ہو - تو وہ گریز نہ کرتے - مگر وہ اپنی ماں یا مکت کیشی سے ملنے
کے خواہش مند نہیں - کیونکہ وہ عورتیں ہیں - اُن لوگوں کا دل اگر سنگین بھی ہو جائے - تو وہ
نوکمار کے دل کا مقابلہ نہیں کر سکتا - مصیبت آنے کے خیال سے جو عورت رنج و غم میں ڈوب
جاتی ہے - ایسی زبردست مصیبت آئی ہوئی دیکھ کر اُس کے دل میں کیسی تکلیف ہوگی - آہستہ
آہستہ رات کا پردہ تمام دُنیا پر پڑ گیا - اُماپتی کو اس کی خبر نہیں - ان سب باتوں کی طرف
اُن کی توجہ ہی نہیں تھی - اگر توجہ ہوتی - تو بھی جس کوٹھڑی میں وہ قید تھے - اُس میں تو رات
دن کی یکساں حالت تھی - رفتہ رفتہ رات زیادہ ہو گئی - اُماپتی بہت پریشان ہوئے - انہوں
نے ہر چند سوچا - مگر انہیں موت سے چھٹکارا کسی طرح نظر نہ آیا - جب تک جیتا رہونگا - رنج و غم
کی شعلہ زن آگ برابر دل و جگر جلاتی رہیگی - یہ ناقابل برداشت ہے - اس لئے جتنی جلدی
موت آ جائے بہتر ہے - اسی لئے موت کا انتظار کرنے لگے - اے پگلی! کیا موت تیرے
اپنے اختیار میں ہے کہ جب تم بلاؤ گے - اُسی وقت آ جائیگی - اور جب اُسے چلا جا کہو گے
تو چلی جائیگی - اُماپتی نے ایک گہرا سانس لیا - اُن سے یہ تکلیف نہ برداشت ہو سکی - موت
کو آتے ہوئے نہ دیکھ کر وہ مایوس ہو گئے - اور کوئی تدبیر نہ دیکھ کر وہ بار بار صبح ہونے کی
دُعائیں مانگنے لگے - مگر آج سب اُن سے خفا تھے - دُکھ کی راتیں قدرتی طور پر بہت

لمبی معلوم ہوتی ہیں۔ اُماپتی نے صُبح ہونے کیلئے کتنی ہی دعائیں مانگیں پھر بھی صبح نہیں ہوئی رات پہاڑ ہوگئی۔ جو رات آج تھی۔ کل بھی وہی تھی۔ کچھ اُماپتی کو دُکھ پہنچانے کیلئے وہ بڑھ نہیں گئی تھی۔ اُن کا دِل دُکھ درد سے بِلویا جا رہا تھا۔ اِسی وجہ سے اُس رات کا خاتمہ نہیں معلوم ہوتا تھا دریائے مسرت میں غوطہ لگانے والوں کیلئے وہی رات چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ دُنیا کا یہی قانون ہے۔ اب جو جس حالت میں رہتا ہے۔ تمام چیزیں اُس کو اُسی رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اُماپتی کے تعلق میں بھی وہی ہُوا۔

عین اِسی وقت آہستہ آہستہ مندر کا دروازہ کھُلا۔ اُماپتی نے گھبرا کر اُس طرف نگاہ کی۔ دیکھا۔ دروازے سے ایک شخص مندر میں داخل ہُوا۔ جلدی میں آکر اُنہوں نے سوال کیا۔ کیا صبح ہوگئی۔ آہا! مجھے لینے آگئے ہو۔ پھر تو نہیں ہوگا ——— میں تو ہی پہنچتا ہوں۔ آنے والے نے اُماپتی کے پاس جاکر دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "چُپ رہو۔ کچھ خوف نہیں۔ میں تمہیں گرفتار کرنے نہیں آیا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ!"

اُماپتی نے گھبرا کر کہا۔ "کہاں جانا ہوگا؟"

جواب مِلا۔ "جہاں میں کہتا ہوں۔ اِس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

اُما "میرا جو نقصان ہو رہا ہے۔ اُس سے بڑھ کر نقصان ہونا غیر ممکن ہے۔ میں اس سے خوف نہیں کھاتا!"

"اچھا آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

اُماپتی جھٹ پٹ سے سوچا۔ یہ چال ہے کچھ سوچا۔ میں چُپکے طور پر اُن کے قبضہ میں ہُوں۔ میرے ساتھ چالبازی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تو اِس شخص کے ساتھ جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟ اور کچھ ہوتا ہو۔ مگر اِس ہوا سے خالی مندر کے باہر تو ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر وہ بولے "چلو!"

وہ شخص آگے آگے چلا۔ اُماپتی اُس کے پیچھے پیچھے چلے۔ یہ شخص ولیم تھا۔ اُس نے اُماپتی کی جان بچانے کا عہد کیا تھا۔ اِسی وجہ سے اُس نے حسین کو مشورہ دیا تھا کہ قیدی کی موت کل ہو۔ قیدی کو آزاد کرنے میں اُس کی کیا خواہش تھی۔ یہ ہم بھی نہیں کہہ سکتے۔ اُماپتی

اور دلبر دونوں جلدی جلدی اُس جنگل میں چلنے لگے۔ بہت دیر تک چلنے پر تکان غالب ہوئی۔ دم لینے کیلئے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اسی وقت آسمان کے مشرقی حصہ سے آفتاب کی زرّین کرنوں کا جلوہ نظر آیا۔ دلبر نے کہا چلو تمہیں جنگل کے راستہ سے باہر نکال دوں۔ دونوں پھر چلنے لگے۔ ایک پہر دن چڑھتے چڑھتے وہ جنگل کو پار کرکے ایک میدان میں پہنچے۔ میدان کے پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں دکھائی دیا۔ اُما پتی نے خوش ہوکر کہا۔ سامنے ہی گوپال پور ہے یہاں میرے ماموں کا مکان ہے۔ آہا!! دلبر نے کہا "ہاں! یہی گوپال پور ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ میں جاتا ہوں"

اُما پتی نے معترف اور احسان مندانہ لہجہ میں کہا۔ "آپ کہاں جائیں گے؟"

دلبر "میں پھر اپنے گروہ میں جا ملونگا"

اُما "آپ جیسے دردرس کا ڈاکوؤں کے گروہ میں نہ رہنا ہی اچھا ہے"

دلبر نے ذرا ہنس کر کہا "ایسا ہونے سے تم خوش ہوگے؟"

اُما "بہت ہی مطمئن ہُونگا"

دلبر "اچھا یہی ہوگا۔ میں پھر ڈاکوؤں کے گروہ میں نہ جاؤنگا"

اُما "تو اس وقت کہاں جائیگا؟"

دلبر "دُوسری جگہ! کچھ کام ہے!!"

اُما "اگر کوئی ہرج نہ ہو۔ تو دو دن ٹھہر جائیے"

دلبر "کیوں؟"

اُما "اپنی حفاظت کرنے والے محسن کا سب کو درشن کرا دیتا"

دلبر "تمہاری یہ خواہش پُوری ہوگی"

اُما "کیونکر؟"

دلبر "پھر ملاقات ہوگی"

اُما "کہاں؟"

دلبر "تمہارے مکان میں!"

اُما۔ "میرا مکان آپ جانتے ہیں۔"

دِلیر۔ "جانتا ہوں۔"

اُما۔ "کب مُلاقات ہوگی؟"

دِلیر۔ "بہت جلد۔"

اُما جی کے چہرے پر خوشی کی مُسکراہٹ دکھائی دی۔ اُنہوں نے کہا "کیا اپنے محسن کا نام بھی میں جان سکتا ہوں؟"

"میرا نام؟ میرا نام جاننا چاہتے ہو۔ ضرور سُنو گے۔ سُنو گے کیوں نہیں۔ میرا نام دِلیر" یہ کہکر جواب کا انتظار نہ کرکے دِلیر نے کہا "تم بے خوفی سے چلے جاؤ۔ خدا حافظ۔ پھر بہت جلد مُلاقات ہوگی۔" یہ کہتے کہتے دِلیر جنگل میں گھُس گیا۔ اُما جی کتنی ہی دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ لاچار ہوکر وہ جلدی جلدی گوپال کی طرف چلے۔

یہ ہری ہر اُما جی کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوئے۔ یہ ذکر بیان سے باہر ہے۔ اُما جی نے اُنہیں اپنا تمام حال سُنا یا۔ سب سُن کر اُنہوں نے اُسی دِن مکان جانے کی ہدایت کی۔ جاتے وقت اُنہوں نے ایک مرتبہ بسنت چارپہ مہاشے سے بھی ملاقات کرنے کو کہا۔ دونوں ماموں بھانجوں نے ساتھ ہی کھانا کھالیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک آرام کرکے اُما جی نے اپنے ماموں کو پرنام کرکے رُخصت لی۔

دِن ڈھل چکا تھا۔ بسنت چارپہ مہاشے کے گھر میں مالکن بیٹھی ہوئی گھبرا رہی تھیں۔ اُس دِن صبح ہی اُما جی آگئے۔ یہ بات اب تک اُن کے گوش گذار نہیں ہوئی تھی۔ وہ بڑی متفکر

تھیں۔ اُماپتی کے لاپتہ ہونے کی خبر نے ہی انہیں متفکر بنا دیا تھا۔ شکنت کیشی کہاں ہے؟ اُس کمرہ
میں مغموم، مایوس اور متفکر بیٹھی ہوئی کیا سوچ رہی تھی۔ نو عمر، جوبن و جوانی سے متوالی نازنین
کے دل کی محبت کیسی حیرت انگیز شے ہے۔ جس دن جس گھڑی معصوم لڑکی نے محبت کو
اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ اُس دن۔ اُسی وقت دنیا اُس کی آنکھوں میں بالکل نئی اور عجیب
غریب دکھائی دی تھی۔ اُس کا دل دریائے مسرت میں جھکولے کھا رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک نئی
جاذبیت و دلکشی کا احساس ہوتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں اُسی دن سے دنیا بے شمار مسرتوں کا گھر
معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ محبت کے بحر بیکراں میں تھی۔ دل ہی دل میں اُماپتی کو اپنا پتی (شوہر)
مان لیا تھا۔ شرم و حیا کے بس میں آ کر یہ بات اپنے دل ہی دل میں چھپا رکھی تھی۔ سوچتی تھی۔
کاش اُس کی اُمید بر آتا۔ اور دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مگر ایشور نے اُس کی طرف نظر ترحم سے
دیکھا۔ اُماپتی کے ساتھ اُس کی شادی طے پا گئی۔ شکنتلا کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ اُس کے جسم کی
خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے۔ دن بدن تتلی جیسی ہوتی گئی۔ شیشے کے محل میں بیٹھی وہ دن چڑھا
جا سکتا ہے۔ وہ آتی دفعہ تک چڑھ گئی۔ مگر بدقسمتی نے اُدھر سے اپنی آنکھ پھیر لی۔ جس وقت
اُس کا دل خوشی و مسرت سے اُچھل رہا تھا۔ اُسی وقت یکایک اُماپتی کے لاپتہ ہونے کی خبر اُس کے
کانوں میں سنائی دی۔ شیشے کا محل شکست ہو گیا۔ شیشے کے سمندر میں کلولیں کرنے والی لڑکی رنج
و غم کے سمندر میں پھنس گئی۔ اسے دنیا کی ہر چیز کاٹتا لگا۔ پھر اُس نے سنا۔ اُماپتی سپنے گرام
پہنچ گیا ہے نہیں ہے۔ تب تو اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ جہاں تک ہو سکا۔ اُس نے اپنے پر
ضبط کیا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ وہ لاکھ گئی گزری ہی سہی شرم ہے۔
اسی خوف سے شکنت کیشی نے حتی الامکان اپنے دلی درد کا اظہار نہیں کیا۔ لوگ سمجھتے کہ وہ
کسی فکر کا شکار نہیں ہوئی۔ مگر اس وقت وہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ موقع پا کر فکر نے بچاری اُس کو
اپنا شکار بنا لیا۔ اسی وجہ سے وہ اس وقت اس قدر ملول و مغموم ہو گئی۔ فکر کی وجہ سے اُس
کا منہ خشک ہو گیا تھا۔

جس وقت اُماپتی اُس کمرے میں داخل ہوئے۔ شکنتا سر نیچا کئے ہوئے بحر تفکر میں غرق تھی
اس وجہ سے وہ اُن کے آنے کی آہٹ نہ پا سکی۔ ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "میرا ایشور اُماپتی!

اُس کے دوسرے دن اُماپتی اور نوکمار اُماپتی کی ماں سے بات چیت کر رہے تھے۔ ناظرین کو معلوم ہے جو پچھلے حصّہ کے ضمیمہ میں نوکمار کو کسی نے پکارا تھا۔ دراصل وہ اُماپتی تھے۔ رات کے وقت گھر آکر اُماپتی نے ماں سے سُنا۔ کہ کل صبح کو نوکمار اُن کی تلاش میں جائیں گے۔ اسی وجہ سے فوراً اُماپتی نوکمار کے پاس گئے۔

اُس وقت وہ ایک ساتھ بیٹھ کر کتنی ہی باتیں کرنے لگے۔ نوکر نے خبر دی۔ ایک شخص آپ لوگوں سے ملنے کیلئے باہر کھڑا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی اُنہوں نے نہایت ہی عاجزانہ انداز سے سلام کیا ... اور کہا "نوکمار! انہوں نے ہی میری جان بچائی تھی۔ انہیں کا نام دلبر ہے"

نوکمار نے دلبر کو مخاطب کر کے کہا "آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ بڑا احسان کیا ہے۔ اس کا شکریہ کیونکر ادا کریں۔ ہم لوگ آپ کا نام اشٹ منتر کی طرح جپتے رہیں گے"

دلبر نے کہا "یہ بات نہ کہئے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ احسان نہیں کہا جا سکتا۔ خون اور گوشت سے مرکب جسم رکھ کر کون ایسا کئے بغیر رہ سکتا ہے؟"

اُماپتی نے نوکمار کو دکھا کر دلبر سے کہا۔ "صاحب! آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ میرے بڑے خیرخواہ دوست ہیں۔ ان کا نام نوکمار مترجی ہے"

بہت دیر تک غور کر کے دلبر نے کہا۔ "مہاشے! آپ کبھی بیدنی پور گئے تھے"

نوکمار۔ "بہت دن ہوئے بجلی سے مکان آتے ہوئے راستہ میں ایک رات سرائے میں ٹھہرا تھا۔ کیوں؟ آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

دلبر "اُس وقت آپ کے ساتھ ایک عورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ آپ کی بیوی تھیں"

نوکمار "ہاں! آپ کو ان تمام باتوں کا پتہ کیونکر لگا؟"

دِلبر۔ "یہ قصّہ بہت طویل ہے مگر سُنئے۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔ کہ آپ نہایت شریف
شخص ہیں۔ آپ کی بیوی کا چال چلن بھی نہایت ہی اچھا ہے۔ اُس دِن شام کو ایک پالکی جاتی
تھی۔ اُسی میں آپ کی بیوی صاحبہ تھیں نہ؟ ہم لوگوں کا گروہ وہاں ہی تھا۔ سب ڈاکوؤں
نے مل کر اُس پالکی پر چھاپا مارنا چاہا۔ میں نے کہا۔ "پالکی لے کر کیا کرو گے؟ دیکھتے نہیں اِس
کے ساتھ کچھ نہیں ہے۔ بے فائدہ چھاپہ مارنے سے کیا حاصل؟" ڈاکو مجھ پر بہت بگڑے۔ انہوں
نے کہا۔ تم کیا نجومی ہو؟ کہ سب کچھ جان گئے۔ کہ اِس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر سب
پالکی پر سے ہٹ اُٹھے۔ اسی اثنا میں ایک اور پالکی آئی۔ اِس میں بھی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ پالکی
کا دروازہ کھول کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی بیش قیمت پوشاک اور شان و شوکت دیکھ کر ڈاکوؤں
کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس وقت اُن سب کو کون روک سکے؟ اُن سب لوگوں نے بغیر کچھ
کہے سُنے پالکی پر چھاپا مارا۔ اور اُس میں جو کچھ تھا سب کا سب لوٹ لیا۔ اُس عورت کی
مُشکیں کس لیں۔

نوکما نے متحیر ہو کر کہا۔ "آپ بھی فرماتے ہیں۔ اُس کے بعد ہی میں وہاں پہنچا تھا"

دِلبر۔ "جی ہاں! آپ کی آواز میں پہچان رہا ہوں۔ شاید آپ کی بیوی کا نام کملا تھا"

نوکما۔ "جی ہاں!"

اُما۔ "وہ کیا رحیم کا گروہ تھا؟"

دِلبر۔ جی ہاں! اُس کا گروہ ہر جگہ رہتا ہے۔ آج کل اُس گروہ کے لئے جیسا سخت
حکم جاری ہوا ہے۔ اُس وقت ایسا نہ تھا۔ جو ہو۔ اور بھی سُنئے۔ اُس کے دوسرے راستہ
میں کیپال کنڈالی کی پالکی نظر آئی۔ اُس وقت آپ لوگ گھر آ رہے تھے۔ رحیم نے حکم دیا۔ پالکی
روک لو۔ اُس وقت آپ کی بیوی کے ہاتھ میں صرف ایک دو زیور تھے۔ میں نے کہا۔ اگر اُس
کے زیور لاؤں۔ تو پالکی روکنے کی کیا ضرورت ہے؟ اُن لوگوں نے کہا۔ ہاں! اگر ایسا کر سکتے
ہو۔ تو روکنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بات سُن کر میں ایک مفلس بھکاری بن کر پالکی کے
پاس جا کر بھیک مانگنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے اُن
کے ہاتھ کے زیوروں کا حوالہ دیا۔ اُما بھی سُن کر چونک اُٹھی۔ ایک ہاتھی دانت کے ٹکڑے

بہت سے قیمتی زیورات رکھے ہوئے تھے - وہ تمام زیورات کے کوٹے تک نکال کر انہوں نے مجھے دیدئے - میں دنگ رہ گیا - اس کے بعد وہ زیورات لیکر چھپت ہو گیا - ڈاکو مجھ پر بہت خوش ہوئے - تیجیم نے کہا - یہ تمام زیور وہ جبر کر دئیے گئے - کسی نے اس سے انکار نہیں کیا - اسی دن سے گروہ میں میری عزت بڑھ گئی - تیجیم میری بڑی خاطر مدارت کرنے لگا - بغیر میری رائے لئے کوئی کام نہیں کرتا تھا - تمام ڈاکو جانتے تھے - دلبر کیا جانتا ہے ؟ جو کچھ ہو - آپ کی بیوی صاحبہ یہ سن کر بہت خوش ہوں گی - وہ اچھی تو ہیں ؟

نوکمار نے ایک لمبا سانس لیکر کہا - ان کی موت ہو گئی - مایوسانہ انداز سے دلبر نے کہا - ان کا انتقال ہو گیا - تب ان زیوروں کو حفاظت سے رکھے ہوئے تھا - کبھی ملاقات ہو گئی - تو آپ ہی جب واپس کر دوں گا -

ان تمام باتوں کو سنتے سنتے آما کی نظریں دلبر کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں - یہ دیکھ کر دلبر نے کہا "کیا دیکھتے ہو ؟"

آما - "مجھے آپ کی نسبت کچھ شک معلوم ہوتا ہے - خیال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے - داڑھی وغیرہ رکھنے سے آپ کی شکل تبدیل ہو گئی ہے"

دلبر کسی قدر مسکرایا - نوکمار نے کہا "تم اُما آپ کے بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں" - خواہ کچھ بھی ہو - مگر یہ تو فرمائیے - ایسے عالی صفات اور سمجھدار ہوتے ہوئے بھی آپ ڈاکوؤں کے گروہ میں کیونکر ملے - یہ میری سمجھ میں نہیں آتا"

اُما - "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ڈاکو نہیں ہیں -"

دلبر - (ہنس کر) "پھر کون ہوں ؟"

اُما - آپ بھلے آدمی ہیں - ڈاکوؤں کے گروہ میں کیونکر آئے - یہ نہیں کہہ سکتا -

نوکمار - "کیا آپ مسلمان ہیں ؟ چال ڈھال اور طرز گفتگو سے تو کچھ شبہ سا ہوتا ہے"

دلبر - "جی ہاں - آپ کا خیال بجا ہے - میں مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہوں اور برہمن"

نوکمار - "برہمن! اور مسلمان ڈاکو کا ساتھ"

اُما - "تو کیا آپ کا نام دلبر [illegible] ہو گا - معلوم ہوتا ہے"

ہے۔ میں نے آپ کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ نام ... ..."

دلیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُماپتی کی بات سن کر بولا۔ "اُماپتی! جب آپ پہچان ہی گئے ہیں۔ تو چھپانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر تم دا ہنوں کبھی کسی سے ذکر نہ کرنا (لوگوں سے) ہم جانتے! میرا نام گوپال کرشن راٹھے ہے ... میں اُماپتی کا بھائی ہوں۔ اِس راز کا انکشاف میں جلد نہ کرتا۔ مگر جب اُماپتی کے دل میں شک پیدا ہو گیا۔ تو صاف صاف کہنے میں ہی مصلحت نظر آئی۔"

اُماپتی کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے۔ گوپال نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا اور فوراً اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھائی بھول کر بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کبھی ایسا اچھا دن دیکھ سکو گا۔ مگر اس وقت استقلال سے کام لو۔ میں اس وقت بھی آزادی سے نہیں مل سکتا۔ دیکھو کسی کو کچھ جاننے نہ پائے۔ ورنہ پھر مجھے نہیں دیکھو گے۔"

اُماپتی نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ گوپال نے پھر کہا "میں تمام باتیں شروع سے کہتا ہوں۔ جب سنو گے تب اندازہ لگا سکو گے کہ میں نے تمہیں کیوں استقلال سے کام لینے کی ہدایت کی ہے۔ دیکھو کہیں کوئی ہے تو نہیں۔ جانتے! [illegible] میں ناپید ہو گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے۔ مگر کیونکر ہوا اس سے آپ آگاہ نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے میں دوسرے گاؤں میں جا رہا تھا۔ راستہ کشتی کا تھا۔ رات کو کشتی ایک گاؤں کے پاس ٹھیری۔ علی الصباح میں ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے میں کنارے پر آیا۔ پاس ہی ایک خوفناک اور گھنا جنگل تھا۔ جنگل میں گھستے ہی کسی شخص کے گلے سے ہائیں ہائیں کی آواز کانوں میں سنائی پڑی۔ اس گھنے جنگل میں اس وقت کون کیسے آیا۔ اور کیا کہتا ہے۔ یہ جاننے کیلئے میرا دل اندر ہی اندر مچلنے لگا۔ میں ذرا پاس جا کر سننے لگا۔ جو کچھ سنا۔ اس سے میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ بڑی طویل داستان ہے۔ حاصل کلام یہ کہ کل رات ڈاکوؤں نے پاس کے کسی دولتمند کا سب کچھ لوٹ کر اس کو اس کی بیوی کیساتھ دھکتی ہوئی آگ میں زندہ جلا دیا۔ اور اس کے معصوم اور شیر خوار بچہ کو زمین پر ٹپک کر مار ڈالا۔ اس بارے میں وہ اپنی اپنی بہادری دکھا کر ہنسی مذاق

کر رہے تھے۔ میرا تمام جسم کانپ اُٹھا۔ سمجھ گیا کہ یہ لوگ ڈاکو ہیں۔ متحیر ہو کر وہیں بیٹھا اُن
کی تمام باتیں سنتا تھا۔ اتنے میں ایک ہیبت ناک صورت والا آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اور بولا
"تم نے میری تمام باتیں سُنی ہیں۔ سچ سچ کہو" میں نے کہا۔ "ہاں" کچھ اور نہ کہہ کر اُس شخص
نے مجھے گرفتار کر لیا۔ مجبور ہو کر بغیر کچھ کہے سُنے میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلا۔ سوچنے لگا
"کہیں یہ مجھ پر حملہ آور ہو کر میرا خون نہ کر ڈالے"۔ وہ مجھے ڈاکوؤں کے گروہ میں لے گیا۔ ایک
نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" جو مجھے لے گیا تھا۔ اُس کا نام رحیم تھا۔ رحیم نے حکم دیا "اسے قتل
کر دو" دیکھتے دیکھتے میرے سر پر دو تین تلواریں چمکنے لگیں۔ میں نے روتے ہوئے
کہا۔ "میری ایک بات سُن لو۔ اس کے بعد جو مناسب ہو کرنا" رحیم نے کہا۔ "کہو" میں نے
کہا "میں نے تم لوگوں کی تمام باتیں ضرور سُنی ہیں۔ مگر میں عہد کرتا ہوں کہ ان کا اظہار
کسی سے نہ کرونگا"۔ رحیم نے کہا۔ "مجھے اس پر اعتماد نہیں"۔ میں نے کہا "میں اب
کہیں بھی نہ جاؤنگا۔ تم لوگ جو کہو گے وہی کرونگا۔ تمہارا ہی ہو رہونگا" رحیم تھوڑی دیر بعد بولا
"تم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہنا پڑیگا۔ ہماری تمام باتیں برداشت کرنی ہونگی۔ ہم لوگ جس وقت
جہاں جائیں گے تمہیں بھی وہاں جانا پڑیگا۔ اور ہم سب کے جیسا لباس پہننا پڑیگا۔ اگر یہ
سب باتیں منظور ہوں۔ تو جان بخشی کی جا سکتی ہے" "اچھا" کہہ کر میں نے یہ تمام شرطیں
منظور کر لیں۔ اُسی دن سے میں ڈاکو بن گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ بہت جلد ان کا راز
فاش کر کے آزاد ہو جاؤنگا۔ پہلے تو مجھے وہ بہت تکلیف دیتے تھے۔ تمام بار میرے سر
پر ہی ڈالتے تھے۔ اپنا کھانا مجھے کھلانے کے لئے تنگ کرتے تھے۔ اور مجھ سے نفرت کرتے
تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد بالخصوص اُس دن سے جس دن سے میں نے کپال کنڈلا کے
زیورات لا دئے۔ مجھ پر رحم ہونے لگا۔ وہ سب کے سب نہایت کوڑ مغز تھے۔ میرے
مشورہ سے بہت سے کام آسانی سے انجام پائے۔ اِس وجہ سے چند دنوں میں ہی
میری بڑی عزت ہونے لگی۔ اِس درمیان میں میں کسی روک ٹوک کے بغیر بھاگ کر گھر آ
سکتا تھا۔ مگر اس میں کسی قسم کی بھلائی کی اُمید نہیں تھی۔ کیونکہ جبر و ظلم سے ڈاکوؤں
نے میرا پتہ ٹھکانہ معلوم کر لیا تھا۔ اگر میں بھاگ آتا۔ تو کسی طرح نہ بچتا۔ میرے ساتھ
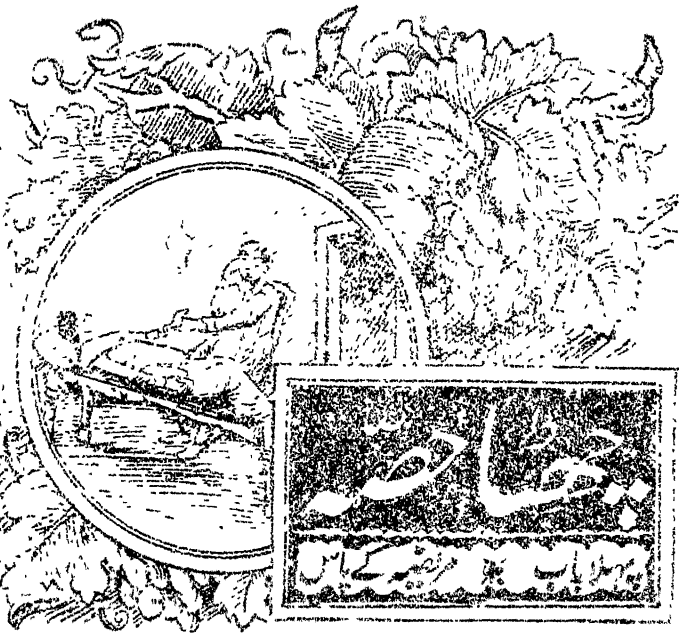
وکمار اُماچی - پدماوتی وغیرہ سب سُکھ سے اپنے دن گذارنے لگے - گرمی کے بعد برسات بھی ختم ہوگئی - برسات کے بعد موسم سرما کا بھی اختتام ہوا شرد کے بعد ہمینت بھی رخصت ہوا - وہ لوگ سب کے سب سُکھ سے اپنے دن گذارتے گئے - اگر دُنیا میں سُکھ ہے - تو وہ لوگ سُکھ کا ہی خواب دیکھنے لگے - مگر دُنیا میں جسے سُکھ سمجھا جاتا ہے - وہ کتنے دِنوں تک ٹھیرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے - کہ وہ ہمیشہ کیلئے سُکھی ہیں - جو کہتے ہیں کہ ہم نے یہ بھی نہیں جانا - کہ دُکھ کسے کہتے ہیں - ہم لوگ دعوے کیساتھ کہہ سکتے ہیں - کہ اُنہوں نے کبھی سُکھ کا مُنہ تک ہی نہیں دیکھا وہ یہ بھی نہیں جانتے - کہ سُکھ کس چڑیا کا نام ہے؟ سُکھ بس اُنہیں سُکھ نہیں ہے - وہ دُکھی ہیں جس نے زندگی بھر میں گوشت یا اُسی قسم کی دیگر کسی چیز کے سوا اور کچھ نہیں کھایا - اُس کا دِل آسو

پدماوتی سے بیمار کا سبب پوچھا تھا۔ مگر اُن کو قابلِ اطمینان جواب نہیں ملا۔ معالج نے آکر مریضہ کو دیکھا۔ اور اپنا سر نیچا کر لیا۔ جاتے وقت نوکمار سے کہہ گیا "مرض کی حالت اچھی نہیں دکھائی دیتی۔" یہ سن کر نوکمار متفکر ہو گئے۔ منہ خشک ہو گیا۔

دوپہر ڈھل گئی۔ پدماوتی کا بخار اُتر رہا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ اور کراہ رہی تھی۔ چار لونڈیاں اُس کی خدمت و تیمارداری میں مصروف تھیں۔ دھوپ نہ آنے پائے۔ اس لئے کمرے کے تمام دروازے بند کر دئے گئے تھے۔ یکایک ایک دروازہ کھلا۔ اُس سے نوکمار داخل ہوئے سب کی نظریں اُسی طرف پھر گئیں۔ پدماوتی نے بھی کروٹ بدل کر دیکھا۔ نوکمار کی آنکھوں سے پدماوتی کی آنکھیں ملیں۔ چار آنکھیں ہوتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ گویا جو کچھ دُکھ درد تھا۔ وہ اسی وقت دُور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ آکر نوکمار مریضہ کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا۔ ان چار دنوں میں ہی پدماوتی خشک ہو کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اُس کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ سرخ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ پدماوتی نے نوکمار کے جسم پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا۔ ایک ہاتھ سے نوکمار نے پدماوتی کا ہاتھ پکڑا اور دوسرا ہاتھ پدماوتی کی پیشانی پر رکھ کر کہا "پدما! تمہارے جسم سے پسینہ نکل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ بخار اب اُتر رہا ہے۔"

پدما نے کہا "ہوگا۔ مگر بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

نوکمار نے کہا "اور دو ایک دن تکلیف ہو گی۔ پھر اچھی ہو جاؤ گی۔ [illegible]"

اب پدما نوکمار کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہنسی۔ اور کہا "تم [illegible] میں اچھی ہو جاؤں گی۔"

نوکمار نے کہا "کیوں پدما؟ یہ تو [illegible] بیماری ہے۔ [illegible]"

پدما نے کہا "نوکمار! [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پدماوتی نے کہا: تم رنجیدہ اور غمگین ہوتے ہو۔ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی تھی۔ کہ تم مرد ہو۔ مردوں میں ضبط کا مادہ عورتوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگر جانتی کہ تمہارے دل کو اس سے چوٹ لگے گی۔ اور تم اداس ہو جاؤ گے۔ تو کبھی نہ کہتی۔ جو ہونے والا ہے۔ وہ ہو گا۔ اس کیلئے پریشان کیوں ہوتے ہو؟

پدماوتی نوکمار کے دل کی حالت تاڑ گئی۔ اور اسی وقت سے دکھ درد کو حتی المقدور پوشیدہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ نوکمار کی طرف پدماوتی نے دیکھا۔ ان کا چہرہ خشک اور اداس ہے۔ بات چیت کا رخ بدلنے کیلئے کہا۔ ناتھ! میری تم سے ایک درخواست ہے

نوکمار نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا کہتی ہو۔ خوشی سے کہو

پدماوتی نے کہا۔ میں عقل سے خالی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں۔ کہ میں جو کہوں گی۔ کہ وہ عقل کے حلقہ سے باہر ہو گا کہ نہیں۔ میں جو کہتی ہوں۔ اس پر تم خوب غور کر لینا۔ اگر وہ کرنے کے قابل ہو۔ تو کرنا۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نوکمار نے کہا۔ اچھا۔ یونہی سہی۔ بات تو بتاؤ۔ کہ کیا ہے؟

پدماوتی نے کہا۔ میں نے شاہنشاہ جہانگیر سے درخواست کی تھی۔ کہ اس شہر میں ایک مرتبہ اور ان سے ملاقات کروں گی۔ اسی وقت وہی خواہش ہو رہی ہے۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو۔ تو بادشاہ سلامت کو خبر کرا دیجئے۔ نوکمار کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات موجزن ہونے لگے۔ انہوں نے سوچا۔ پدماوتی کی یہ خواہش کوئی بری نہیں ہے۔ جسکو ایک دن پدماوتی نے اپنا دل دیا تھا۔ اسے یکدم بھول جانا غیر ممکن ہے۔ پدما کے دل کی حالت سے میں بخوبی واقف ہوں۔ اگر وہ اس وقت آئینے کی طرح صاف ہے۔ تو بھی پچھلے تعلقات کی یاد کہاں جائے گی؟ اسی یاد سے پدماوتی کی ایسی خواہش ہوئی ہے۔ یہ کچھ نامناسب نہیں ہے۔ پھر بھی اس ملاقات سے ہرج کیا ہے؟ پدما کے دل میں میل آنا مشکل ہے۔ پھر کیوں اس کی خواہش کے راستہ میں رکاوٹ ثابت ہوں۔ یہ سوچ کر انہوں نے کہا۔ پدما! یہ بات! یہ تو اچھی بات ہے۔ ضرور۔ کوئی آدمی خبر لے کر جائیگا۔ مگر آئیں گے کہ نہیں۔ اس میں شک ہے۔

خشک اور مرجھائے ہوئے دل کو مسرت کے آنسوؤں میں ڈبو دیتے تھے جس کمرے میں پڑے پڑے کتنے ہی دنوں تک عیش و مسرت کی راتیں کاٹی تھیں جس آستانہ پر پدما نے فرطِ محبت سے جھوم جھوم کر بارہا جبہ سائی کی تھی جہاں محبت کی کتنی ہی چھپی چھپی باتیں سنائی گئی تھیں - جہاں شرابِ محبت کے کتنے ہی دور چلے تھے۔ آج اسی کمرے میں نوکمار مایوس اور غمزدہ دل سے داخل ہوئے - اس میں اب وہ اگلی سی رونق نہیں رہی تھی - دیپک کی دھیمی روشنی سے تمام مکان میں مایوسی نظر آتا تھا -

مریضہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی - پاس ہی لکڑی کی ایک چوکی پر شمع روشن تھی - مگر پھر بھی تاریکی غالب تھی - نوکمار روشنی کے پاس کھڑے ہو گئے - ان کے پاؤں کی آہٹ سے مریضہ چونک اٹھی - کروٹ بدل کر دیکھا - دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں - پدماوتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دی - مگر وہ مسکراہٹ اس کی فطری مسکراہٹ نہیں تھی - نوکمار کی آسودگی کے خیال سے اس مرتبہ بھی پدما ہنسی تھی -

نوکمار نے پوچھا "پدما! اس وقت کیسی طبیعت ہے ؟"

بہت دھیمی آواز سے پدماوتی نے کہا - "اچھی ہوں"

اس وقت بھی پدما نے اصل بات پوشیدہ رکھی تھی کہیں نوکمار کے دل پر چوٹ نہ لگے اس وجہ سے اپنی تکلیف کا پوشیدہ رکھنا ہی اس نے مناسب سمجھا - حکیم جس وقت پدما کو دیکھ کر جا رہا تھا - اس وقت نوکمار سے ملاقات ہوئی تھی - اس نے نوکمار سے کہا تھا مریضہ کی حالت بہت خراب ہے - کل ہفتہ ختم ہو گیا جس کا اندیشہ تھا - وہ وقت نکل گیا - اس ہفتے میں اگر خاص طور سے توجہ نہ دی گئی تو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا - جب سے اچھی سے اچھی دوا دی - مگر کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا "

نوکمار پدما کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے - پدما نہ معلوم کس غیر معمولی طاقت سے اٹھ کر بیٹھ گئی - نوکمار نے اسے پکڑ لیا - پدما نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا - ایک آنکھ بند ہو گئی - دوسری سے وہ برابر نوکمار کی طرف دیکھتی رہی - دونوں خاموش تھے - دونوں کے دل میں ایک آندھی سی چل رہی تھی - اس وقت دل میں جس زور سے خیالات کا دریا موجزن تھا

اس وقت پُرملال نہیں تھی۔ نکمار مغموم و متفکر نگاہوں سے پدما کی طرف دیکھنے لگے۔ آہ! یہ محو ہستی دل فریب سے دل و جگر کی زنجیر سے مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہے۔ وہ ہمیشہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہو جائیگی۔ انہوں نے دیکھا۔ پدما کے سرخ گالوں کی وہ آب و تاب باقی رہی ہے؟ سایہ جا بجا سے داغ پڑ گئے ہیں۔ آنکھوں کے حلقوں میں سیاہی دوڑ گئی ہے۔ ہونٹوں کا رنگ گلابی کی بجائے سفید ہو گیا ہے۔ اُس کے جسم میں جو آب و تاب حُسن لطافت اور ملاحت تھی۔ اس وقت وہ معدوم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

نکمار کے بدن میں تیزی سے خون دوڑنے لگا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے قابو میں نہیں رہ سکے۔ وفور بیتابی سے پدماوتی کو سینے سے لگا کر اُس کا منہ چوم لیا۔ مضطرب اور غمزدہ دل ذرا دیر کیلئے خوش ہوا۔ اور نکمار کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ اُن کی گھبراہٹ اور بے چینی دیکھ کر پدماوتی نے کہا۔ پریتم! آپ اتنے مضطرب کیوں ہیں۔ اب بہتر نہیں۔ نہ جانے کیوں آپ سے ملنے ہو نہ معلوم انجام میں کیا ہوگا؟ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تمہارے نفس سے میرا کم دکھ درد دور ہو گیا میں اس وقت روحانی سکھ کا احساس کر رہی ہوں۔ اس وقت سچ کہتی ہوں۔

یہ کہتے کہتے پدما کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور نکمار کا سینہ تر بتر ہو گیا۔ انہوں نے پاگلوں کی طرح پدماوتی کی طرف دیکھا۔ متحیر ہو کر دیکھا کہ پدما اس وقت بھی مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پدما نے نکمار کی گود سے اپنا سر اٹھا کر ایک تکیہ پر رکھ دیا۔ نکمار نے غم دل کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر اس کا چھپنا کیا آسان تھا؟ رہ رہ کر لمبے لمبے سانس اور جسم کی بے [illegible] ان کے غم کا پتہ دینے لگی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نکمار نے کہا۔ پدما! انسان کی یہی حالت ہے قسمت کو یہی منظور ہے۔ یہ حالت سب کے لئے ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ضرور ہی ہو کر رہیگا۔ کس میں طاقت ہے کہ اُس کی روک تھام کر سکے۔ تمہارا درد تو اس وقت ویسا تکلیف دہ اور خطرناک نہیں ہے۔ اپنے دل کی گھبراہٹ اور پریشانی سے میں نے جن باتوں کا اظہار کیا ہے۔ اُن میں سے ایک کے بھی ایسے آثار نہیں نظر آتے۔ ایشور چاہیگا۔ تو تمہاری علالت طول نہ پکڑیگی۔ یقیناً تم اچھی ہو جاؤگی۔ خوف کس بات کا؟

ٹوکمار نے دل کی بات نہیں کہی - دل میں جو شبہ گزرا تھا - اُسے پڑاوتی کو تسکین دینے کی خاطر چھپا رکھا -

پڑاوتی نے کہا "خوف کیا ہے کچھ بھی نہیں - مرض مہلک ہو یا معمولی - ڈرنے کی کیا بات ہے؟ موت سے خوف کرنے پر کیا انسان اُس سے رہائی پا جاتا ہے کبھی نہیں - پھر کیوں ڈروں؟"

پڑاوتی کے منہ سے ایسی حوصلہ افزا باتیں سن کر ٹوکمار کے مضطرب دل میں بھی کسی قدر استقلال پیدا ہوا - اپنے پیاروں کی مصیبت دیکھ کر دل کو سخت تکلیف ہوتی ہے - مگر وہ اگر خود تکلیف میں ہو - اور استقلال سے کام لے - تو ضرور ہی افکار و آلام میں کسی قدر کمی ہو جاتی ہے - اس میں کوئی شک نہیں - قدرت کا یہ خوبصورت قانون ہر وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے - جوں جوں موت کے قریب آتا جاتا ہے - توں توں موت کا راستہ نہایت ہی صفائی سے نظر آتا ہے - اور ہر طرح آسان معلوم ہوتا ہے - اور جوں جوں یہ واہمہ پختہ ہوتا جاتا ہے - توں توں اُس جسم کی خوفناک اور ہیبت ناک صورت گویا ایک دلآویزی اختیار کرتی جاتی ہے - بالآخر جیسے تھکا ہوا بچہ اپنی ماں کی گود میں سو جاتا ہے - اسی طرح انسان ملک عدم میں جا پناہ گزیں ہوتا ہے - اسی قانون کے زیر اثر آکر پڑاوتی نے وہ حوصلہ بخش تقریر کی - پڑاوتی کی تمام باتوں کو ٹوکمار بڑے غور سے سن رہے تھے - اور اُن پر غور و خوض کر رہے تھے - اسی وقت دربان نے آکر خبر دی - بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر شاہنشاہ جہانگیر تشریف لائے ہیں - ٹوکمار گھبرا کر اُٹھ بیٹھے - منہ سے صرف اس قدر نکلا - "آ گئے"

پڑاوتی نے کہا - "تم جاؤ!"

ٹوکمار بے چینی کے ساتھ پڑاوتی کے کمرے سے باہر ہو گئے -

میں ڈوبی ہوئی پدماوتی کی کتاب زندگی کا ایک ہی ورق تمام ہو جائیگا - اُس کیلئے دوائیں بے سود ہیں - میں نے زندگی کی اُمید چھوڑ دی ہے - اب جینے کی ضرورت بھی نہیں ہے - اسی وجہ سے میں آئی ہوئی موت سے ذرا بھی ڈرتی نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے - انسانی زندگی میں لطف پائے سکتے ہیں - آپ کی عنایات بیکراں سے میں ان سے حظ اٹھا چکی ہوں - مگر ان سب میں جب تک محبت رہتی ہے - اسی وقت تک سکھ کا احساس ہوتا ہے - یہ محبت کتنے دنوں تک رہتی ہے - محبت کم ہوتے ہی سکھ بھی کافور کی طرح اُڑ جاتا ہے - میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں - اس وقت بھی کہتی ہوں ان سب میں ذرا بھی سکھ نہیں ہے - اگر ہوتا ہے تو میرے سکھوں کا کاسہ ویسا ہی بھرا رہتا - اصل سکھ جس میں ہے وہ یہ بدنصیب اُس وقت تک نہیں جان سکی جب جانا - اُس وقت عہد گذشتہ کی یاد سے یہ دل نیم سوختہ لکڑی کی طرح سُلگنے لگا - اس لئے یہ بدنصیب دُنیا میں سکھ کا نشان نہیں دیکھ سکی - سکھ کے پانے کیلئے میں نے کیا کیا نہیں کیا - کون سا پاپ باقی رکھ چھوڑا ہے - جو کچھ کیا سب سکھ کے حصول اور خواہشات نفسانی سے سیر ہونے کے لئے کیا - مگر حضور! آپ سے چھپانے سے کیا حاصل ؟ پاپ کی وجہ سے میرا جسم اور دل دونوں جل کر خاک ہو گئے - صرف اسی قدر کیوں؟ میں کبھی بھی سکھی نہیں ہوئی - میں کیا اس وقت سکھی ہوں ؟ نہیں ! حضور! مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے - پہلے ہی کیوں یہ راستہ اختیار نہیں کیا ! رہ رہ کر پچھتاتی ہوں - اسی پچھتاوے کی آگ میں دل اور جگر دونوں جل بھن کر کباب ہو رہے ہیں - یہ جلن مٹنے والی نہیں نظر آتی - اگر معمولی ہوتی - تو مٹ بھی سکتی تھی - اسی وجہ سے کہتی ہوں - کہ اس بدنصیب کو جینے کی ضرورت نہیں - اس کا مرنا ہی اچھا ہے - وہ مبارک وقت اب قریب ہے - خوش نصیبی کی بات یہ ہے - کہ اس کیلئے بہت دنوں تک اب انتظار کرنا پڑیگا - پاپی پدماوتی کی پاپی جان اب زیادہ دیر تک یک لمحہ دُنیا میں نہیں رہیگی -

اگرچہ پدماوتی نے یہ تمام باتیں نہایت ہی آزردہ دلی اور کمزور لہجہ میں آہستہ آہستہ کہی تھیں - تاہم اس مختصر تقریر سے بھی اُسے تکان محسوس ہوئی - وہ خاموش ہو گئی - زور زور سے سانس چلنے لگا - بادشاہ سلامت نے تمام باتیں سُنیں - وہ زیادہ دیر تک اپنے آپ کو ضبط میں نہ رکھ سکے - آنکھیں ڈبڈبا آئیں - گہری اور سرد آہوں نے نہایت ہی پژمردہ

بنا دیا۔ کپکپاتی ہوئی آواز سے بولے۔ پدماوتی! تمہارے ساتھ آخری ملاقات اس قدر خوفناک ہوگی
مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ تم نے جو کچھ کہا۔ وہ ہو یا نہ ہو۔ مگر یاد آتے ہی تمام جسم کانپ
اٹھتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے اپنا مایۂ دل ایک دن تم پر نثار کیا تھا۔ بڑی تکلیف اٹھا
کر دل کو پتھر جیسا سخت کر کے تمہارے سکھ کے راستہ میں جانے دیا تھا۔ مگر پدماوتی تم ہی بتاؤ کہ
میں اب کس طرح خاموش رہوں؟ تم خواہ مجھ سے ہزاروں کوس کے فاصلے پر کیوں نہ رہو۔ مگر ہمیشہ
میرے دل میں رہتی ہو۔ میں تنہا ہوں۔ گو تمہاری نظریں اب بدل گئی ہیں۔ تو بھی میں باوجود
کوشش کے بھی تمہیں اپنے خانۂ دل سے ہٹا نہیں سکتا۔

عہد گذشتہ کی یاد اور انسانی گرمجوشیوں کے اثر سے جہانگیر کا دل جلنے لگا۔ اُن کی آواز
مدھم پڑ گئی۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے بالکل ہی سکوت اختیار کر لیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب
جاری ہو گیا۔ فرط بیخودی سے انہوں نے پدماوتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آنسوؤں سے پدماوتی کی نازک
کلائی تر ہو گئی۔ پدماوتی نے مضطربانہ انداز سے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا حضور! آپ کی باتیں سن کر
پچھلی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ گویا سب کی سب آنکھوں کے سامنے پتلیوں کی طرح ناچ رہی ہیں۔
چلتے چلاتے آپ سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں۔ میرا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس
وقت خوف کس بات کا ہے۔ جب دنیا سے روح کو تھوڑی دیر میں چھوڑ دوں گی۔ اس سے خوف
کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ سن کر کیا کہیں گے یہ نہیں کہہ سکتی۔ خواہ آپ مجھے ہی کیوں نہ خیال
فرمائیں۔ آخری وقت بستر موت پر میں کھلے بندوں اپنا گناہ قبول کروں گی۔ آپ مجھے کس قدر پیار
کرتے تھے۔ یہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن بندہ نواز! جھوٹ نہ سمجھئے۔ میں پتھر ہوں۔
اس وقت اُس لامحدود محبت کا ایک ذرّہ بھی میں کسی کو نہیں دے سکتی تھی۔ آپ سن لیجئے کہ اکثر
دنیا میں مجھ جیسی بدبخت آزاد مزاج عیش پسند عورتوں کا یہی حال ہے۔ اُن کا یہی طرزِ معاشرت
اور یہی کام ہے کسی کو دھوکا دینا ہی سب کچھ ہے۔ آپ نے میرے سکھ کیلئے کیا کچھ نہیں کیا تھا
لیکن میں پاپی ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ اور خود کتنے پاپ کئے ہیں۔
اس سب پر طرہ یہ کہ کتنے محبت کے متوالوں کو اپنی اُلفت کے جال میں پھنسا پھنسا کر سینہ
[illegible] اور انہیں گناہ کے بحر ناپیدا کنار میں غرق کر دیا۔ آپ ہی خیال فرمائیے۔ میرے

دُوبی پڑیگا۔ اس طرح اُن کے دل کو اپنا بنا کر، اور اُنہیں اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر نفرت کے
عوض رغبت کی شے پیش کرا کتنے کم عرصہ میں بیچارگی ہمیشہ کیلئے اُنہیں چھوڑ کر چلی جائیگی۔ اس
سے زیادہ خوشی کی بات اُن کے لئے اور کیا ہوگی؟

پدماوتی اور جہانگیر کو ایسی حالت میں دیکھ کر نوکمار دوسرے کمرے میں چلے گئے
اور مغموم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ گو سردی کسی قدر پڑ رہی تھی۔ تاہم نوکمار نے کھڑکی کے پاس
جا کر اُس کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سردی کی رات کی قدرتی تاریکی میں چھوٹے ستاروں کی جھلک
دکھائی پڑتی۔ اُس کے بائیں جانب کئی چھوٹے چھوٹے مکان تاریکی میں ایک ڈھیر کی طرح نظر
آتے۔ مکانوں کے پاس ہی ایک بڑا وسیع میدان تھا۔ اُس میدان کے درخت اور راستے
سے ہوئے مکانات سب موسم سرما کی رات کی تاریکی میں یکساں نظر آتے تھے۔ جھروکے کے
نزدیک ہی ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ نوکمار اُسی پر بیٹھ گئے۔ بدن پر جتنے کپڑے تھے۔ وہ سب
اُتار کر پھینک دئے۔ اس پر بھی گرمی رفع نہ ہوئی۔ ہوا کے طرب خیز اور فرحت بخش ٹھنڈے جھونکوں
نے اُن کی چھاتی کو ٹھنڈک دینی شروع کی۔ مگر دل کی گرمی میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ اے پاگل!
تو یہ کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ آگ آسانی سے بجھ جائیگی؟ پانی ڈال دو۔ برف دو۔ یا دُنیا کی سرد سے سرد چیز دو۔
مگر یہ جلن کسی طرح رفع نہ ہوگی۔ نوکمار کے دل کی اُس وقت جو حالت تھی۔ وہ نہایت ہی خوفناک
تھی۔ وہ دُنیا کی ناپائداری اور اُس کے عارضی حالات پر غور کر رہے تھے۔ کھڑکی کے راستے سے جہاں
تک نظر جاتی تھی۔ ہر چہار طرف رنج و غم اور موت وغیرہ مختلف اشکال میں گھومتی دکھائی دے رہی
تھیں۔ جس وقت نوکمار اپنے تختِ دل کی سلطنت سے دست بردار ہو کر بیٹھے تھے۔ اُس وقت
ایک اور شخص اُس کمرے میں آیا تھا۔ مگر نوکمار کو قطعی خبر نہیں ہوئی۔ آنے والے نے آہستہ آہستہ
نوکمار کے پاس آکر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ نوکمار چونکے۔ اُنہوں نے گھبرا کر اُس کی طرف
دیکھا۔ معلوم ہوا۔ اُما پتی ہیں۔ اُما پتی نے کہا۔ بھائی! کیا سوچ رہے ہو؟ جو کسی طرح ہونی ہے
رُک نہیں سکتی۔ اُس کیلئے سوچ کرنا عقلمندوں کا کام نہیں

نوکمار۔ بھائی! میں ایسا کچھ نااتراش نہیں ہوں۔ کسی اور ہی فکر میں پڑا تھا۔ دُنیا فانی
ہے۔ یہاں زیادہ دن تک کون رہیگا؟ تعجب یہی ہے کہ انسان اس طرح مایا میں پھنسا ہوا ہے؟

مجھ اس وقت کہنے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایک وقت میں بالکل پدماوتی کے بس میں تھا لیکن موقع پاکر سب کچھ ہوتا ہے۔ پدما کے پاپی دل میں بھی دھرم کا نور چمکا۔ اُس وقت پدماوتی نے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کا مزا لوٹنا چاہا۔ میں اُس کی مرضی کے برخلاف کرسکتا تھا۔ مگر بعض وجوہات سے میں نے اُس کے کام میں رخنہ انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ پدما جس دن مجھ سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ کیسی بری گھڑی تھی۔ اُس کا تذکرہ میں آپ سے کیا کروں؟ جو ہو میں نے دل پر جبر کرکے پدما کو رخصت کیا۔ مگر دل کو رخصت نہیں کرسکا جس کے ساتھ چند دن بیشتر اس قدر ربط ضبط تھا۔ اُس کے ہجر میں یکایک جو تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اُس کا تذکرہ زخم جگر کو تازہ کرتا ہے۔"

لوکمار ۔ اُس کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اُس کا اشارۃً بھی ذکر نہ کرنا چاہتا ہوں!!

جہانگیر ۔ سچ کہتے ہو۔ ہونی ہو کر رہیگی۔ اُسے کون روک سکتا ہے۔ آپ جیسا آدمی جو نہایت مستقل مزاج محقق کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت میں ضرور ہی گھبرا جائیگا۔ مصیبت میں ایسی خوشی کے موقع پر صرف یہی فائدہ ہوا کہ آپ سے ملاقات حاصل ہوگیا۔ میرے اور آپ کے تعلقات دن بدن استحکام پاتے جائیں۔ یہ میری دلی خواہش ہے۔ آپ غور کیجئے۔ میری یہ خواہش بیوجہ نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی پدماوتی کی زنجیر محبت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لگاؤ آسودگی بخش نہیں۔ اس کے علاوہ پدماوتی دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔ اُس کے حالات جس قدر ہم لوگوں کو یاد رہیں گے۔ اُس قدر اور کسی کو نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم دونوں آپس میں دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ تو دل کو بڑی آسودگی ہوگی۔ میں نے آپ کو خط لکھا تھا۔ یقیناً وہ آپ کو ملا ہوگا۔"

لوکمار نے عاجزانہ انداز سے کہا: "جی ہاں! کئی وجوہات سے بالخصوص یہ سوچ کر کہ کیا جواب دوں؟ میں جواب نہ دے سکا۔ اُس کے لئے میں قصوروار ہوں۔"

جہانگیر ۔ خط کا کام اس وقت زبان سے لیں گے۔ خط میں آپ نے تھوڑی سی جاگیر نذر دینے کو لکھا تھا۔ آپ نے اُسے قبول کیا یا نہیں۔ ... اگر آپ قبول کریں۔ تو میں بہت خوش ہونگا۔"

نوکمار نے جھجکتے جھجکتے کہا "میں نے اس بارہ میں بہت غور وخوض کیا ہے۔ قبول کرنے سے کسی طرح انکار نہیں۔ یہ خاکسار تو ایسے اعزاز کا مستحق نہیں۔ آپ کی عنایات ایک دیہاتی کے حال پر ہو رہی ہیں جو اس قابل نہیں۔ خواہ کچھ ہو۔ مگر حضور والاشان کا نذرانہ قبول کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"

جہانگیر۔ "میں اس سے بہت خوش ہوا۔ امید ہے ہم لوگوں کے تعلقات دن بدن بڑھتے جائیں گے۔ اب اس وقت آرام کرنے کو طبیعت چاہتی ہے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ سلامت اٹھ کھڑے ہوئے۔ نوکمار اور آمانچی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔

چمپا کی موت سے متعلق کچھ لکھنا نہایت ہی رقت انگیز اور پُر سوز مضمون ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔

ایک دن بہت [illegible] ہوا۔ جس دن ان کی [illegible] زیادہ [illegible] تیمارداری میں صرف ہوا ہو۔ مگر [illegible] آنسو [illegible] دل میں نہیں۔ دیکھتے دیکھتے سترہ دن گذر گئے۔ آج جو چمپا کی حالت تھی۔ وہ نہایت ہی خطرناک تھی۔ حکیم صاحب [illegible] اتفاق رائے [illegible] نوکمار [illegible] کھڑے تھے۔ اس وقت چمپا سو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ [illegible] پاس سے اٹھ کر گئے۔ وہاں ایک حکیم سے ملاقات ہوئی۔ "مریضہ سو رہی ہے۔ اگر آپ اس وقت دیکھ لیتے تو بہت بہتر ہوتا۔"

حکیم صاحب [illegible] دیکھ کر لوٹ آئے۔ نوکمار نے پوچھا۔ "کہئے! کیا دیکھا!"

حکیم۔ "نبض کی رفتار اس وقت [illegible] ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ دو چار گھنٹے

حکیم چلے گئے۔ نوکمار نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا "پیاری پدماوتی! میری قسمت بہت ہی کھوٹی ہے۔ میں تمکو ۔ ۔ ۔ ۔"

پدماوتی نے کہا: "پران ناتھ! مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ دیر تک مجھے دنیا میں نہیں رہنا ہوگا۔ ہات پاؤں کانپ رہے ہیں۔"

نوکمار یکایک چونک کر پدماوتی کو غور سے دیکھنے لگے۔ دیکھا۔ اس کی بھویں چوڑی ہوتی جا رہی ہیں۔ اور آنکھیں اوپر چڑھتی جا رہی ہیں۔ اور سر چکرا رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پدماوتی ایکا ایکی غش کھا کر گر پڑی۔ نوکمار نے فرط اضطراب سے چونک کر پدما کا سر پکڑ لیا اور وہی دوا پلانے لگے۔ بڑی دقتوں۔ بڑی کوششوں اور بہت دیر میں تھوڑی سی دوا حلق کے نیچے اتری۔ دیکھتے دیکھتے پدما کی آنکھیں پھر پہلے کی سی ہو گئیں۔ اتنے میں کئی آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اسی وقت بادشاہ سلامت۔ آغا جی اور حکیم لوگ آ گئے۔

حکیم مریضہ کی حالت دیکھنے کیلئے آگے بڑھے۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر بادشاہ سے کہا۔ ایک گھنٹہ بعد بی بی صاحبہ پھر بیہوش ہونگی۔ وہ بیہوشی دور نہیں ہو سکیگی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ اسی بیہوشی کیساتھ ان کی زیست کا خاتمہ ہو جائیگا۔

جہانگیر ایک لمبا سانس لیکر مریضہ کے پاس آئے۔ پدماوتی کچھ دیر تک اُن کا منہ تکتی رہی۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی جہاں پناہ! آخری وقت میں اب اور آپ سے کیا کہوں میری زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہمیشہ کیلئے آپ لوگوں سے رخصت ہوتی ہوں۔ مجھے یاد کیجئیگا اپنی موت سے جب میں خود ہی دکھی نہیں ہوں۔ تو آپ لوگ کیوں ہوں گے؟ پاپی کی یاد سے کیا سکھ ہوگا؟"

مضطربانہ انداز سے بادشاہ نے کہا: "پدماوتی! اس سے زیادہ اُن کے منہ سے اور کوئی بات نہیں نکلی۔

پدما "حضور! میں کون ہوں؟ میں نے دنیا میں پاپ کیا ہے۔ جہاں تک ہوگا پاپ ہی کی ترقی کی ہے۔ میں پاپن ہوں۔ پاپن کو کیوں اپنے دل میں جگہ دیجئے؟ میرا نام

ہی دُنیا سے اُٹھ جائے۔ تو بہتر ہے۔کسی کے دِل میں اُس کا نشان نہ رہے۔ یہی میری دِلی آرزو ہے۔

بادشاہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ سب خاموش تھے۔ کوئی کیا کہے؟ بہت دیر تک خاموش رہ کر پدما بولی۔ "رفتہ رفتہ میری تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔ باتیں کرتے تکلیف ہوتی ہے۔ جتنی باتیں تھیں۔ اِس وقت اُن کا کہنا غیر ممکن ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے گویا موت نے مجھے اپنا لقمہ بنا لیا ہے۔ جو ہو کرو۔ جان سے پیارے نوکمار! [چُپ رہنے کے بعد] تمہیں بہت سی باتیں کہوں گی۔ (خاموش) اِس وقت کہہ سکوں گی۔ ایسا تو نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بات کہتی چلوں۔ ..... اسے میرا اصرار سمجھنا۔ کہو۔ کہ اِس کے بعد کپال کنڈلا کا پتہ لگاؤ گے۔ (خاموش) اگر منظور کرو۔ تو اس وقت تو موت موجود ہے تبھی اس حالت میں تھوڑی سی شانتی اور سُکھ کا احساس کروں گی۔ اور کچھ کہنا امکان سے باہر ہے"

پدما چُپ ہو گئی۔ اُسے بہت تکلیف معلوم ہوئی۔ وہ بہت دُکھی ہوئی۔ نوکمار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولے۔ پیاری! تمہارے سُکھ کیلئے میں جامِ زہر بھی پینے کیلئے تیار ہوں۔ یہ تو بہت معمولی بات ہے"

اِس وقت لوگوں نے دیکھا۔ پدما میں چراغ کی طرح بجھنے کے تمام آثار نمایاں ہیں اُس نے بڑی دقت سے کہا۔ "اب دیر نہیں ہے۔ نوکمار ..... سوامی! مجھے رخصت کرو۔ سب ختم ہُوا۔ میں زندگی بھر کیلئے ...."

پدما کا گلا پھنس گیا۔ اور کوئی بات نہ کہہ سکی۔ دُکھی دِل سے نوکمار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خوف کیا ہے؟" یہ کہہ کر پدما کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اُس وقت پدما کا جسم بالکل سرد ہو تا جا رہا تھا۔ آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔ تاہم وہ ٹکٹکی باندھے نوکمار کی طرف دیکھتی رہی۔ دم کے دم میں ہی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آخری وقت آ پہنچا۔

"ان ..... دو" کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی۔ زندگی کا یہ آخری فقرہ تھا کئی مرتبہ ہچکیاں لائیں۔ مگر اُس کا مطلب کون سمجھے؟ سانس لینے کیلئے صرف تین چار بار منہ پھیلایا۔

طائر روح نے قفسِ عنصری چھوڑ دیا۔ پدماوتی کی زندگی کے ناٹک کا آخری تماشہ ختم ہوا بڑی کوششوں سے پالتے ہوئے ڈرے سے نوکمار کا نام ہی اس کی زندگی کی آخری بات ثابت ہوئی۔ جب جان سر آرام دہ تکیہ سے کھسک گیا۔ سورج غروب ہوا۔ اس نے تاریکی میں اپنا سر چھپا لیا۔ اس کے ساتھ ہی پدماوتی کی زندگی کا چراغ بھی بجھ گیا۔ زندگی بھر میں اس نے سکھ نہیں پایا۔ سکھ کیلئے اس نے کیا نہیں کیا۔ تقریباً ایک سال سے وہ کسی قدر سکھ پا رہی تھی۔ اس سکھ کے دن کا بھی آج خاتمہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سب کچھ بے مزا ہوگیا۔

پدماوتی کی موت کے تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد ۔ آج سے کوئی دو کوس جنوب کی کی طرف گنگا میں ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ پوس کا مہینہ تھا۔ اور رات کا وقت۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ ہر چہار طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات سردی سے ٹھٹھر کر بہت پہنچ ہو گئے۔ اس سے کشتی کنارے پر لگا دی گئی۔ صبح ہوتے ہی دو شخص کشتی سے باہر نکلے یہ دونوں نوکمار اور اناپورنا تھے۔ انہوں نے کہا "کل اندھیرے میں نہیں معلوم ہوتا تھا کشتی کہاں لگائی گئی ہے اس وقت دیکھتا ہوں۔ تو اچھا سا گاؤں لگتا ہے۔"

یہ کہکر دونوں چلے۔ راہ میں ٹہلتے ہوئے ایک برہمن سے اناپورنا نے پوچھا۔ "بابا اس گاؤں کا کیا نام ہے؟"

برہمن نے جواب دیا "حبشی پور"

"حبشی پور" کا نام سنتے ہی نوکمار بہت خوش ہوئے۔ جیسے کوئی دولت مل گئی۔ سب کچھ بھول گئے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ ایک راستہ پر آگئے۔ یہی گاؤں میں آنے جانے

کی راہ لی - راستہ تک آنے پر انہیں گاؤں کا اندرونی حصہ دیکھنے کی خواہش ہوئی - بات چیت کرتے دونوں بہت دور تک چلے گئے - سامنے کا ایک مکان انہیں بہت پسند آیا - ایسے چھوٹے سے گاؤں میں یہ مکان فخر کے قابل تھا - دونوں اس مکان کو دیکھنے لگے - نوکمار کی نظر اُس مکان کی چھت پر پڑی - اُناپتی کی نگاہیں اُس وقت دوسری طرف تھیں - نوکمار نے دیکھا - لطافت و ملاحت کی ایک مجسم خوبصورت نازنین یکسوئی سے پاس والے جنگل کے نظارہ کا لطف اُٹھا رہی ہے - اُس کے چہرے کا ایک ہی حصہ نوکمار کو دکھائی دیا - یکایک اُس نازنین کے دل میں نہ معلوم کیا خیال پیدا ہوا کہ وہاں سے ہٹ گئی - چلتے ہوئے اُس کے دلفریب اعضاء نوکمار نے دیکھے - دل میں آرزوؤں اور امنگوں کی ایک آگ سی لگ گئی - انسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ اس آگ کی لو کی آنچ بھی برداشت کر سکے - نوکمار کا بے حس و حرکت جسم بریدہ شاخ کی طرح زمین پر آ رہا - یکایک ان کی یہ حالت دیکھ کر اناپتی گھبرا گئے - کیونکہ اُن کو بڑی دقت ہوئی - جب نوکمار ہوش میں نہیں - ایسی حالت میں انتظار کرنا بھی مناسب نہیں یہ سوچ کر جیسے کسی طرح لاد کر انہیں کشتی پر لائے -

اُس دن شام کو نوکمار کو بیہوشی کی حالت میں لئے ہوئے کشتی تومیپ کے نیچے آ گئی - اس عرصہ میں نوکمار کو کئی بار تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا تھا - اور اس وقت جو باتیں نوکمار نے کہی تھیں اُناپتی کی سمجھ میں اُن میں سے ایک بھی نہیں آئی - نوکمار کو اٹھا کر اناپتی مہترا ناتھ کے یہاں لائے بڑی کوششوں سے رات کے آخری حصہ میں انہیں کسی قدر ہوش آیا - اُس وقت نوکمار نے کہا - کپال کنڈلا ہے - میں نے اُسے اپنی آنکھوں دیکھا ہے - اس میں مجھے کسی قسم کا شک نہیں - دیر کرنے کی ضرورت نہیں - تم لوگ چلو - میں آج ہی وہاں جاؤں گا تم لوگ یہاں کیوں لے آئے -

اناپتی - مہترا ناتھ - پجاری جی وغیرہ سب لوگ یہ سن کر دنگ رہ گئے - انہوں نے اور کسی بات کا اعتنا بھی نہیں کیا - نوکمار بھی جلد پورب جانے کیلئے بیتاب ہوئے - مگر چونکہ کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی - اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ وہ چار پانچ دن بعد کشتی پر جائیں گے -

پجاری جی تقریباً ایک مہینہ سے قریب آ گئے تھے۔ نوکمار نے وہاں پہنچنے میں اتنی
دیر لگا دی۔ مجبور ہو کر پجاری جی ان کے انتظار میں ٹھہرے رہے۔ اپنی دیوی کی پوجا کیلئے وہ
بہت گھبرا رہے تھے مگر اس وقت جلد جا سکیں گے۔ اس کی بھی امید نہیں تھی۔ نوکمار کے
پہنچے ہوئے بغیر کہیں نکل جانے کی ہمت کرتے۔ دھرم پال گنڈا کے متعلق جو باتیں نوکمار نے
کہی تھیں۔ اگر مان لیا جائے کہ یہ سب لغو اور غیر ممکن ہیں۔ تو بھی اس کا انجام دیکھے بغیر
ان کا جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے انہیں کچھ دنوں کیلئے ٹھہرنا پڑا۔

دو دن بعد نوکمار اور اُماپتی متھرا ناتھ کے گھر سے نکلے ہوئے راستہ پر ٹہلتے
ہو کر طرح طرح کی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ راستہ سے ہو کر بہت سے لوگ جا رہے تھے
یکایک اُماپتی نے کہا "بھٹاچاریہ مہاشے آ رہے ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئے۔"
نوکمار نے پوچھا "یہ کون ہیں؟"
اُماپتی۔ "ہمت کیتی کے باپ ہیں۔"
اتنے میں بھٹاچاریہ مہاشے آ گئے۔ اُماپتی اور نوکمار دونوں نے انہیں پرنام کیا
متحیر ہو کر اُماپتی نے پوچھا "آپ یہاں کہاں۔ سب خیریت تو ہے نہ؟"
بھٹاچاریہ "جی ہاں سب خیریت ہے۔ ایک کام کیلئے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ
نہیں ہوا۔ اب گھر جا رہا ہوں۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟"
اُماپتی نے نوکمار کی طرف دیکھ کر کہا "یہ ہمارے گہرے دوستوں میں سے ہیں ہم
دونوں کا گھر ایک ہی گاؤں میں ہے۔ یہاں ان کی بہن کی سسرال ہے۔ ان کے بہنوئی
سے میری بھی واقفیت ہوئی۔ ان سے ملنے کے لئے میں آیا تھا۔ ہم لوگ اس مکان واپس

ناواقف تھے۔ اگر انہیں علم ہوتا۔ تو وہ ضرور ہی مجھے خبر دیتے۔ بالآخر مایوس ہو کر میں بھوانی کے مندر میں لوٹ آیا۔

میرے آنے میں بہت توقف ہوا تھا۔ واپسی پر میں نے دیکھا۔ کپالی کپال کنڈلا کو سمندر کے کنارے کے جنگلوں میں لے گیا ہے۔ کپال کنڈلا نے اس وقت بالکل جوگنوں کی سی حالت بنائی تھی۔ وہاں اس قسم کے کپڑے اور زیورات مل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ حسن کی ترقی میں جس قدر باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ وہ تمام کپال کنڈلا میں موجود تھیں۔ وہ لگی تھی اس سب سے کپال کنڈلا تربیت ہو کر خوب نکھر گئی تھی۔ اور بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ جن دلوں کی طرح جنگل جنگل گھومنا اس کی عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ پاس نہ ستم تھا کوئی چیز اس سے باقی نہیں رہی تھی۔ وہ برابر ہر وقت کسی نہ کسی وقت میرے پاس آتی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنی دلی کیفیت روکتا تھا۔ اسے دیکھتے مجھے بڑی فکر ہوتی تھی۔ کپالی جس مقصد سے اسے لایا تھا۔ وہ مجھے معلوم تھا۔ اس لئے کپال کنڈلا کو اس کے پنجے سے چھڑانے کیلئے میں بہت بے چین ہوا۔

باپ کیا ہے؟ ماں کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ کپالی کون ہے؟ گھر کہاں ہے؟ میں یہاں کیسے آئی؟ ان سب باتوں کا کپال کنڈلا کو ذرا بھی علم نہیں تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں پوچھتی تھی۔ بعد میں کہیں کپال کنڈلا کے دل میں کوئی برا خیال نہ پیدا ہو۔ اس لئے میں نے تمام باتیں اس سے پوشیدہ رکھیں۔ وہ بھی عجیب غریب لڑکی تھی کبھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی دانست میں وہ جنگل ہی سب کچھ تھا۔ اس کی دنیا اسی جنگل تک محدود تھی۔ وہ سمجھتی تھی سمندر کے کنارے کا جنگل ہی جنگل ہے۔ ساتھ خوفناک جانوروں اور کپالی کو دیکھ کر ہی تمام دنیا کی ہے سب لوگ دنیا سمجھتے ہیں۔ سادہ لوح لڑکی اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لئے وہ کبھی [illegible] ہوتی تھی۔ کپالی اکثر کبھی کبھی لوگوں کو پکڑ لاتا تھا۔ اور ان کی قربانی کرتا تھا۔ جب کپال کنڈلا کو یہ بات معلوم ہوئی۔ تو اسے سخت دکھ ہوا کہ ہم لوگوں کے علاوہ اور لوگ بھی دنیا میں ہیں۔ کپالی کی قربانی دیکھتی تھی وہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ کپالی اپنی عمر دراز کرنے کیلئے آدمی کی قربانی کرتا ہے۔ ایک دن دوران گفتگو میں کپال کنڈلا نے مجھ سے پوچھا۔

"کپالی کے قربانی کرنے والے آدمی کہاں رہتے ہیں؟" اُس کی یہ بات سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ جہاں تک ممکن تھا، مختصر طور پر اُسے دُنیا کی باتیں سمجھائیں جہاں تک اُس کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ میں نے اُس کے ذہن نشین کرایا۔ کہ کیوں کپالی اُسے آتی دشتوں سے پال پوس رہا ہے۔ سب سُن کر کپال کنڈلا کسی قدر متحیر اور خائف ہوئی۔ عصمت وقت جو فرقۂ اناث کا گراں بہا اور مخصوص جوہر ہے میں نے بخوبی اُس کے خاطر نشین کر دیا تھا۔ وہ اپنی حالت کے لحاظ سے متفکر ہوئی بیقرار ہو کر بولی "کیا ہوگا۔ میں کیونکر آزاد ہو سکتی ہوں؟" میں نے کہا۔ "یہاں سے بھاگ جانے کے سوا اور کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ بڑی دقتیں ہیں۔ تم ماتا بھوانی کے سایۂ عاطفت میں آئی ہو گھبرانے کی کوئی بات نہیں بھوانی ماتا ضرور تمہاری حفاظت کریگی۔"

اِس وقت کپال کنڈلا کو بھاگ جانے کا اچھا موقع تھا۔ شمال کی جانب سے میرا ایک چیلا مجھ سے ملاقات کرنے آیا۔ کپال کنڈلا نے اس کے ساتھ بھاگ جانیکا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہُوا۔ میرا یہ دل نہ چاہا کہ میں اُسے ایک غیر شخص کے ہمراہ بھیجوں۔ لیکن بھوانی ماتا کی جو اِچّھا ہوتی ہے۔ وہی ہوتا ہے کسی شخص کی کیا مجال ہے؟ جو اس میں کچھ ردّ و بدل کر سکے میں نے کپال کنڈلا کو اس کے ساتھ نہ جانے دیا۔ کپال کنڈلا کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی رفتہ رفتہ اُس نے باغ شباب میں قدم رکھا۔ جن میں کھلے ہوئے نئے پھول کیطرح اُس کا لاثانی حُسن و جمال خود ہی نشو و نما پانے لگا۔ وہ میرے لئے نہایت ہی فکر اور تشویش کا باعث ہوگئی۔ سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ ہر گھڑی کپال کنڈلا کی بہتری کے خیال کے سوا اور کوئی بات میرے دل و دماغ میں نہ آتی تھی۔ میں ہر وقت یہی سوچا کرتا تھا۔ کہ کپال کنڈلا کے نصیب میں کیا لکھا ہے اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ سوچتے سوچتے بعض اوقات میں نہایت گھبرا اُٹھتا تھا۔ اس سے میرا خون آہستہ آہستہ خشک ہوتا جاتا تھا۔

فطرتاً عورتوں کا دل دوسروں کا دُکھ دیکھ کر پسیج اُٹھتا ہے۔ کپالی جنہیں [illegible] میں گھر لا رکھتا تھا کو پکڑ کر قربانی کرتا تھا۔ اس سے کپال کنڈلا کو بہت رنج ہوتا تھا۔ کچھ دن ہوئے بڑی بدقسمتی سے تم کپالی کے پنجے میں آ پھنسے کپال کنڈلا اس وقت طرح طرح کی کوشش کر کے میرے پاس کھاگتی آئی۔ میں نے دیکھا کپالی اس بات سے کپال کنڈلا پر بہت ناراض ہے۔ ممکن ہے۔ اس

دریا بہہ رہا تھا - اور اس سے لڑکی کا تمام بدن تربتر ہو رہا تھا - جیسے کالے کالے گھنگھور بادلوں میں بجلی کی چمک اٹھتی ہے - اسی طرح سیاہ بالوں میں نازنین کا چہرہ تجلی نما ہو رہا [illegible] آنچل سے نوکمار کو پنکھا کر رہی تھی - رفتہ رفتہ نوکمار کے چہرے پر ہوش کے آثار دکھائی دئیے - انہوں نے آنکھیں کھول دیں - اس وقت بھی نازنین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے - [illegible] نازنین کے پاؤں پکڑ کر کہا :-

"پیاری کپال کنڈلا! کہو!! مجھے معاف کیا؟ گو میں تمہارا [illegible] ہوں - تاہم تمہیں معاف کرنا ہوگا - میں دوزخی ہوں - تمہیں میں نے بہت دکھ دیا ہے - میرے اس [illegible] - میری پیاری! اگر تم مجھے معاف نہ کرو گی تو میں [illegible]

[illegible] لگے - ان کے منہ سے اور کوئی بات نہیں نکلی [illegible] تمہارا قصور کیا ہے [illegible] ہوا - ایشور نے کیا ہے کہ ہم دونوں پھر ملے - اس [illegible] روتے کیوں ہو؟"

جس طرح بین کی دلربا تانوں سے سننے والے کا دل بے تاب ہو جاتا ہے - اس آواز نے بھی نوکمار کے دل کو اسی طرح از خود رفتہ بنا دیا - انہوں نے محسوس کیا - کہ وہی پیاری دلکش آواز ہے - اس آواز نے آج ان کے دل پر محبت کا اثر پھونک دیا - انہوں نے دیکھا - کہ یہی کپال کنڈلا ہے - نوکمار نے کپال کنڈلا کو لپٹا لیا - کب تک وہ اس پر لطف ہم آغوشی کا مزا لیتے رہے - کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا -

اسی اثنا میں اُماجی بھی وہاں آ پہنچے کسی نے انہیں نہیں دیکھا - اُماجی نے کپال کنڈلا کو پہچانا - پہلے تو انہیں خواب سا معلوم ہوا - بعد میں شک دور ہوا - انہوں نے فوراً جا کر بھٹاچاریہ جا کے - پجاری جی [illegible] بابو کو یہ خوش خبری سنائی - سب لوگ دوڑے آئے خوشیوں کی حد نہ رہی - پجاری جی بار بار کپال کنڈلا کا سر سونگھنے لگے - سبھی کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے - ضعیف بھٹاچاریہ کپال کنڈلا کو دیکھ کر فرط مسرت سے ہنسنے

اور رونے لگے۔ پجاری جی نے کپال کنڈلا سے اُن کا تعارف کرایا۔ اور کپال کنڈلا کیساتھ اُس کا
جو تعلق تھا - وہ بھی بتایا۔ آنکھ سے مسرت کے آنسو گراتی ہوئی کپال کنڈلا نے باپ اور چچا
کو پرنام کیا۔ رفتہ رفتہ پجاری جی نے اُسے بہت سی باتیں بتائیں تھوڑی ہی دیر میں رام داس
رائے خبر پاکر وہاں آپہنچے۔ ایک ایک کرکے تمام باتیں شروع سے آخیر تک سُن کر بولے:-

"اِس لڑکی جیسی سُتی روئے زمین پر شاید دوسری نہ ہوگی - یہ میری اپنی لڑکی کیطرح
ہے - اُتماوتی (رکمنی) تم پرائی ہو کر بھی میری اپنی ہوئی تھی - تمہیں میں بہت پیار کرنے
لگا تھا - اِس وقت تم میری نسبت زیادہ عزیز رشتہ داروں میں پہنچ چکی ہو - ایشور کی کرپا سے
تم سُکھی رہوگی - بھگوان تیری عمر دراز کریں - میں تجھے کبھی دیکھ سکونگا - اِس لئے ماں باپ
بھی تمہارے ساتھ تمہاری سسرال چھوڑونگا -"

سب خوش ہو گئے - گویا پہلے دُنیا سے رنج کا نام ہی حرفِ غلط کی طرح اُڑ گیا - بڑی
خوشی اور ولولہ کیساتھ سپتگرام روانہ ہو گئے -

مصیبت کی ستائی ہوئی کپال کنڈلا اتنے دنوں بعد - اپنا گھر اپنا شوہر -
ماں - باپ - بہن وغیرہ سے ملی - لڑکپن سے ماں باپ کی پیار کیلئے ترستی ہوئی وہ اپنے
پہلو میں مست کپالی کی کپال کنڈلا - شوہر کی ہرنی تھی - اور محافظ (رام داس رائے)
کی اتماوتی پھر سے حاصل ہوئی تھی - ہم بھی کپال کنڈلا کے واقعات کے اِس پوشیدہ
حصّے کو ناظرین کی نذر کرکے رخصت ہوتا ہے ٭

جس مقصد سے یہ چھوٹا سا ناول لکھا گیا تھا گو وہ پورا ہوا - تاہم یہ پردہ گرانے سے
پیشتر ناول کے مختلف کیرکٹروں کے تعلق میں دو ایک باتیں لکھے بغیر خاموشی اختیار کر
لینا مصنف کیلئے نامناسب ہے -

کہنا فضول ہے کہ کچھ دنوں بعد ہی اُدیاپتی کی شادی نکت کیشی کیساتھ ہوگئی - یہ خبر بھیج کر شیاما سسرال سے بلالی گئی - نکت کیشی کی شادی سے لیکر اُس کے بعد تک ہرن مئی اپنے باپ کے گھر رہی -

اِن سب واقعات سے کچھ دن پہلے ولبھ یعنی گوپال کرشن ڈاکوؤں کے گروہ سے نکل کر ماں باپ سے ملے - راجہ کے حکم کے بموجب رحیم کو پھانسی کی سزا ہوئی - گوپال کو انعام ملا - اور دربار میں منصب جلیلہ کا اعزاز بخشا گیا -

پجاری جی کئی دنوں تک سپت گرام ہی میں رہ کر پھر چلے گئے - شیاما وغیرہ بہت خوش ہوئے ۔

ناول میگزین کے سلسلے کے نہایت ہی دلچسپ پُر اثر
اور مقبول عام عمدہ ترین ناول

تصوف کا بہترین سرمایہ
آٹھ کتابوں میں
ملنے کا پتہ